

بس اک داغِ ندامت

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ پہلے وہ جب گھر آتی تھی تو اس کے ہتھیے ہتھیوں کا ہنگامہ باہر تک آ رہا ہوتا تھا۔ لان عبور کر کے وہ اندرونی دروازے تک پہنچ گئی اور پھر اس میں اتنی ہمت اور حوصلہ باقی نہیں رہا کہ وہ تیل بجاتی اور گھر والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دیتی، کوئی بھی لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو اتنی ہی بے حوصلہ ہوتی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے ہوئے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔ اور وہ جیسے ان سے بالکل بے خبر تھی۔ پھر عذرا بھابھی نے اچانک اسے اندروانی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ غم و غصہ میں ڈوبی ہوئی وہ کچن میں گئی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میونہ بھابھی نے انہیں اس سر اسیمبلی کے عالم میں آتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”مومل واپس آ گئی ہے۔“

”کیا؟“ میونہ بھابھی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”وہاں برآمدے میں بیٹھی ہے۔ میں نے اسے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ تم یہ بتاؤ فاروق کیا کر رہا ہے؟“

”وہ تو سو رہے ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ عذرا بھابھی میونہ کو ساتھ لے کر باہر آ گئیں۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ اٹھ کر کھڑکی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو

اور تیزی سے بہنے لگے۔

”کیا لینے آئی ہو یہاں؟“ عذرا بھابھی کا سوال اس کی سماعت سے ہم کی طرح ٹکرایا تھا۔

”بھابھی!“ وہ صرف یہی کہہ سکی۔

”یہاں سے چلی جاؤ جہاں تین دن گزارے ہیں وہاں باقی زندگی بھی گزار سکتی ہو۔“ عذرا بھابھی نے دہلی

آواز لیکن تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

”بھابھی! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو اغوا کر لیا گیا تھا۔ آپ.....“

عذرا بھابھی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ ڈرامہ کسی اور کے سامنے کرنا۔ ہمارے لیے تم اور تمہارے لیے ہم مر گئے ہیں۔ تم اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہو اگر انہیں تمہارے آنے کا پتا چل گیا تو وہ تمہیں جان سے مار دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے تم اپنی جان بچاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ عذرا بھابھی نے بہت زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

”بھابھی پلیز! مجھ پر رحم کریں۔ میری کوئی غلطی نہیں۔ میں کہاں جاؤں گی؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عذرا بھابھی پر اس کے آنسوؤں کا الٹا اثر ہوا۔

”یہ اس وقت سوچنا تھا جب گھر سے بھاگی تھی۔ تمہیں اپنے بھائیوں کو متاثر بناتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ ان سے کیسے کیسے سوال کریں گے۔ تم نے ہم پر رحم نہیں کیا ہم تم پر رحم کیوں کریں۔ ہم نے بھی اپنی بیٹیاں بیاتنی ہیں اور تمہیں گھر میں رکھ کر ہم ان کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں معاف کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ ہم پر رحم کرو۔ تمہارے بھائی تمہیں قتل کر دیں گے اور خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔ تم کیوں ہمارا گھر برباد کرنا چاہتی ہو؟ یہاں سے جاؤ۔“

بھابھی بات کرتے کرتے اسے بازو سے پکڑے ہوئے گیٹ تک لے آئیں اور پھر گیٹ کھول کر ایک جھکے سے اسے باہر دیکھیل دیا۔ گیٹ بند کرتے وقت انہوں نے کہا۔

”دوبارہ یہاں مت آنا۔“ وہ سیکھے کے عالم میں بند گیٹ کو دیکھتی رہی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اسے گھر والوں کی نفرت اور غصے کا سامنا کرنا پڑے گا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اسے گھر سے نکال دیں گے۔ شاید اس لیے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے قصور سمجھ رہی تھی۔ لیکن اسے بے قصور نہیں سمجھا گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ اب کہاں جائے گی پھر اس نے باری باری اپنے سارے رشتہ داروں اور دوستوں کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے اور جیسے کوئی پینڈ ورا باکس کھل گیا تھا۔

ایک ہی دن میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا جو چیزیں گزرے ہوئے بیس سال اسے نہیں سکھائیں تھیں۔ وہ اس ایک دن نے اسے سکھا دی تھیں۔ وہ رشتہ داروں کے رویے سے دلبرداشتہ نہیں ہوئی اگر سگی بھابھیاں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکی تھیں تو کوئی چچا یا پھوپھی کیسے رکھ لیتے لیکن دوستوں کے رویے نے اسے حقیقتاً رلا لیا تھا۔ شاید اس کے بھائی اس کی تلاش میں اس کی سب دوستوں کے گھر جا چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاں گئی وہاں پہلے سے ہی اس کے بارے میں بہت سی داستانیں موجود تھیں۔ باری باری وہ اپنی چاروں دوستوں کے گھر گئی۔ فاریہ کی امی نے دروازے پر ہی اس سے کہہ دیا کہ فاریہ گھر پر نہیں ہے اور پھر دروازہ بند کر لیا۔

سائزہ کی امی نے بڑی درشتی سے اس سے پوچھا۔

”سائزہ سے کیا کام ہے؟“ وہ کہنے کی ہمت نہیں کر پائی اور وہاں سے پلٹ آئی۔ باقی دونوں دوستوں کے

بس ایک داغِ ندامت

گھر بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا تھا۔ وہ دوست جو تین دن پہلے تک اسے کھینچ کھینچ کر اپنے گھر لے جاتی تھیں۔ اب اسے پانی تک پلانے پر تیار نہیں تھیں۔ مول میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان سے مدد مانگتی اس نے ان کی ہمد پر اپنی زندگی برباد کر لی تھی اور وہ اسے پچھاننے کو تیار نہیں تھیں۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ایک سڑک کے کنارے لگے ہوئے سرکاری نکلے سے اس نے پانی پیا اور دوبارہ بے مقصد سڑکوں پر چلنے لگی۔ اس کی دوست اس کا واحد سہارا اور آخری امید تھیں اب اور کوئی نہیں تھا جس کے پاس وہ مدد کے لیے جاسکتی۔ وہ خالی لذنی کی کیفیت میں سڑک پر چل رہی تھی جب اس نے اچانک کسی کے منہ سے اپنا نام سنا تھا۔

”مول! مول!“ اسے اپنا نام بے حد اجنبی لگا تھا۔ پھر اچانک کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہتھوڑا۔

”کہاں گم ہو تم؟ آواز ہی نہیں سنتیں۔ میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں۔“

اس بار اس نے آواز اور چہرہ پہچان لیا وہ فاطمہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی جو بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مول سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ فاطمہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی کچھ چونک گئی تھی۔

”کیا ہوا مول! تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے تشویش سے اس کی سوچی ہوئی آنکھوں اور سے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

”کیا ہوا ہے مول! تم اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ اس بار فاطمہ نے ہلکے سے اس کا کندھا ہتھوڑا تھا۔ مول کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

”انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔“ وہ یہ کہہ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

فاطمہ اور اس کی ساتھی لڑکی اسے روتے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ مین روڈ پر کھڑی تھیں اور لوگ آتے جاتے ہوئے انہیں گھور رہے تھے۔

”فاطمہ! میں گاڑی لاتی ہوں۔ ہم مول کو ہاسٹل لے جاتے ہیں پھر وہیں سب کچھ پوچھتا۔“

رہیہ یہ کہہ کر تیزی سے کار پارکنگ کی طرف گاڑی نکالنے چلی گئی۔ فاطمہ اسے چپ کروانے میں لگ گئی لیکن وہ چپ ہونے کے بجائے اور زیادہ رونے لگی تھی۔ اس کے اس طرح رونے پر فاطمہ کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹوں بعد رہیہ کار لے آئی اور فاطمہ اسے کار میں بٹھا کر ہاسٹل لے آئی تھی۔ ہاسٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد بھی وہ اسی طرح چٹکیوں اور سسکیوں سے روتی رہی مگر اس بار فاطمہ نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی۔ رہیہ اور فاطمہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر رہیہ نے دراز سے ایک ٹیبلٹ نکال کر پانی کے گلاس کے ساتھ فاطمہ کو تھما دی۔

”اسے یہ ٹیبلٹ کھلا! دو اگر یہ اسی طرح روتی رہی تو مجھے ڈر ہے کہیں اس کا مزہ بیک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ تم اسے چپ کرواؤ۔ میں تمہارے لیے چائے اور اسٹیکس بھجواتی ہوں۔“

رہیہ ہلکی آواز میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ فاطمہ نے بڑی نرمی سے ایک بازو اس کے کندھے کے

گرد و خاک کر لیا اور پیار سے اسے جھپکنے لگی۔

”میری طرف دیکھو مومی! دیکھو چپ ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا پریشانی ہے۔ پرسوں تمہاری بھانجی نے ہاسٹل فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تم یونیورسٹی سے گھر نہیں پونچیں اور تمہاری یونیورسٹی کی فرینڈز نے بتایا ہے کہ تم اس دن یونیورسٹی گئی ہی نہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ کہیں تم میرے پاس تو نہیں آئیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ تم یہاں نہیں آئیں اور دو دن میں انہیں فون کر کے پوچھتی رہی کہ تمہارا کچھ پتا چلاکل میں تمہارے گھر بھی گئی مگر تمہارے گھر والوں کو تمہارا کچھ پتا نہیں تھا۔ اور آج تم مجھے سڑک پر مل گئی ہو اور تم کہہ رہی ہو کہ انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ تم اتنے دن کہاں غائب رہی تھیں؟“ فاطمہ اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ آنسو بہاتی رہی۔

”مول! اپنی پریشانی مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری مدد کر سکوں۔“ وہ بڑے نرم لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

”فاطمہ! اگر میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا تو کیا تم مجھے یہاں سے نکال دو گی؟“

اس نے روتے روتے فاطمہ سے پوچھا تھا۔ فاطمہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”نہیں مول! میں بھلا ایسا کیوں کروں گی۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی، چاہے تم سے کوئی غلطی کیوں نہ ہوئی ہو۔“

فاطمہ نے جیسا اس کی ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ بیٹے آنسوؤں کے ساتھ ہونٹ جھینچے ہوئے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ فاطمہ سے اس کی دوستی بڑے عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ فاطمہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی۔ چیکلی دفعہ ان کی ملاقات مول کے کالج میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے بلڈنگ لگایا تھا۔ مول اپنا بلڈنگ روپ چیک کروانے گئی تھی مگر وہاں فاطمہ کے اصرار پر اس نے اپنا بلڈ ڈونیت کیا۔ دونوں کے درمیان دوستی کا آغاز ہو گیا تھا۔ فاطمہ کی ساری فیملی سعودی عرب میں تھی اور وہ اکیلی پاکستان میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ پھر دونوں اکثر ملنے لگیں۔ مول ہر ویک اینڈ پر فاطمہ کو اپنے گھر بلا لیتی اور اکثر خود بھی اس کے ہاسٹل چلایا کرتی۔ جلد ہی دونوں کی دوستی اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ باہر سے آنے والی چیزوں میں سے آدھی چیزیں فاطمہ سے تھا دیا کرتی تھی۔ مول کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے بعد ملاقاتوں میں کچھ کی آگئی تھی مگر فاطمہ کے التفات میں نہیں وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح اسے فون کیا کرتی تھی لیکن اب وہ پہلے کی طرح ہر ویک اینڈ پر اس کے گھر نہیں آتی تھی کیونکہ وہ میڈیکل کے فائنل ایر میں تھی اور اتنا فالتو نام اس کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ مول کو پہلے فاطمہ کے پاس جانے کا خیال نہیں آیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ بھی دوسری دوستوں کی طرح اسے دھتکار دے گی۔ مگر اب اسے فاطمہ کے پاس ہی پناہ ملی تھی۔

مول دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ وہ اس وقت دس سال کی تھی جب اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا اور اسے دونوں بڑے بھائیوں نے پالا تھا۔ انہوں نے اسے بالکل پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ بھانجیوں کو نند سے شوہروں کا یہ التفات کھلتا تھا لیکن وہ زہر کے گھونٹ پینے پر مجبور تھیں۔ شوہروں کو خوش کرنے کے لیے وہ ظاہری طور پر اس پر صدقے واری جاتی تھیں۔ کیونکہ اس کے طفیل ان کی بہت سی فرمائشیں ان کے شوہر پوری کر دیتے

بس ایک داغِ ندامت

تھے۔ مول اگر سمجھ دار ہوتی تو بھابھیوں کے بناوٹی رویے کو سمجھ جاتی لیکن اس میں اگر یہ خوبی ہوتی تو شاید وہ اس حال تک کبھی نہ پہنچتی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے اشاروں پر چلا کرتی تھی۔ کسی نے اس کی تھوڑی سی تعریف کی اور کسی کام پر اکسایا اور اس نے بلا سوچے سمجھے وہ کام کر دیا۔ اس بات کا اندازہ لگائے بغیر کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس پر کیا اثر ہوگا۔ وہ ہمیشہ وہی کرتی تھی جو اس کی دوستیں کہا کرتی تھیں۔

بعض دفعہ اسے اس بات کا فائدہ ہوتا مگر زیادہ تر اسے نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی دوستوں کو سائنس ٹیکنکس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس نے شاندار نمبروں کے باوجود سائنس پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کی دوستوں کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ کسی کو بتائے بغیر وہ چیز اپنی فرینڈز کو پہنچا دیتی۔ اس کی دوستوں نے ہمیشہ اس کے کندھے پر ہندوق رکھ کر چلائی۔ سائزہ کو سکول سے باہر کوئی لڑکا ٹھک کرتا تھا۔

”مول یا راتم تو بہت بہادر ہو۔ یا راکسی طرح میرا پیچھا اس لڑکے سے چھڑاؤ۔“

سائزہ کا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ اگلے دن وہ چھٹی ہوتے ہی سائزہ کے بتانے پر سیدھی اسی لڑکے کے پاس پہنچ گئی اور جاتے ہی اسے دھمکانے لگی۔ وہ لڑکا اس صورت حال پر گھبرا گیا۔ اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور دوبارہ سائزہ کے لیے وہاں کھڑا نہیں ہوا اس کی دوستوں نے اسے خوب شاباشی دی۔ لیکن سکول میں اس کے بارے میں چھ مگیوئیاں شروع ہو گئیں۔ شاید ان داستانوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا لیکن خوش قسمتی سے وہ سکول میں اس کا آخری سال تھا۔

کالج پہنچنے پر بھی اس نے اپنے طور طریقے نہیں چھوڑے۔ دوستوں کے لیے اس کے کارناموں میں وہاں بھی کمی نہیں آئی۔ ہر مشکل مرحلے پر وہ اسے ہی سامنے کرتیں اور وہ بلا خوف و خطر ڈٹ جاتی۔ بعد میں اس کی دوستیں اس کی بے تحاشا تعریفیں کرتیں۔

”بھئی، مجھے تو مول پر رشک آتا ہے۔ کتنی بولڈ ہے وہ، ہم تو لڑکوں کو دیکھتے ہی چھپے لگتی ہیں۔ یہ اسی کی ہمت ہے کہ انہیں منہ توڑ جواب دیتی ہے۔ لڑکیوں کو اسی جیسا ہونا چاہیے۔“

تعریفوں کے یہ لہلہ مول کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیتے۔ یونیورسٹی میں جانے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پہلی دفعہ وہ اور اس کی فرینڈز کو ایکشن میں آئی تھیں۔ اس لیے کافی زور تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی دوستوں نے پھر پرانے حربے استعمال کرنے شروع کر دیے۔ جو لڑکا ان پر ریمارکس پاس کرتا وہ جواب دینے کے لیے مول کو آگے کر دیتیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہلے سال ہی یونیورسٹی میں خاصی مشہور ہو گئی۔ لیکن یہ شہرت نیک نامی کے زمرے میں نہیں آتی تھی۔ لڑکے پہلے کی نسبت اب اس پر زیادہ ریمارکس دیتے تھے۔

پھر انہیں دنوں ڈیپارٹمنٹ میں ایک لڑکے کے چرچے ہونے لگے اور یہ چرچے صرف لڑکیوں میں ہی نہیں لڑکوں میں بھی تھے۔ اسٹڈنٹس کے لیے یونیورسٹی ہی نہیں تھی۔ چند ماہ پہلے اس نے اسی یونیورسٹی سے اسکاٹس میں

بس ایک داغِ ندامت

ماسٹرز میں ٹاپ کیا تھا اور اب وہی ایس ایس کی تیاری کے لیے دوبارہ کلاسز اٹینڈ کرنے کے لیے یونیورسٹی آنے لگا تھا۔ اور اس کی آمد نے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں کے درمیان بناؤ سنگھار کا ایک مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں ان کا کوئی اتنا زیادہ قصور بھی نہیں تھا جس شخص کا نام اسفند حسن تھا۔ وہ واقعی دیکھنے کی چیز تھا۔ اس کی صرف پر سنائی ہی زبردست نہیں تھی بلکہ اس کا ذہن بھی کچھ غیر معمولی ہی تھا۔ سارے پلس پوائنٹ ہونے کے باوجود حیرت کی بات یہ تھی کہ یونیورسٹی میں اس کا کوئی سیکینڈل کبھی مشہور نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی پر سنائی اور ذہانت کی وجہ سے اس کا شہرہ تھا۔ وہ مکمل تیاری کے ساتھ لیگچرز اٹینڈ کیا کرتا تھا اور کلاس میں اس کی موجودگی پروفیسرز کو خاصا چونکا رکھتی تھی کیونکہ اس کی تاریخ کسی بھی چیز کے بارے میں بہت اپ لو ڈیٹ تھی اور وہ کسی بھی لمحہ کوئی بھی سوال کر سکتا تھا اور اس کے سوالات عام نہیں ہوتے تھے۔ وہ اکثر پروفیسرز کو مشکل میں ڈالتا رہا تھا۔ سی ایس ایس کی تیاری کے سلسلے میں وہ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں بھی ایک کلاس اٹینڈ کرنے آیا کرتا تھا اور اس کی آمد نے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں اچھی خاصی ہلچل مچا دی تھی۔

جن دنوں اس نے آنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں مول بیاتھی اور اس نے ایک ہفتہ کی چھٹی لی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ یونیورسٹی آئی تھی تو وہ اپنی دوستوں کی گفتگو سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ان کی زبان پر بس ایک ہی بات تھی۔

”ہائے آج اسفند بلیک ڈیٹم میں کیسا لگ رہا تھا؟“

”اسفند پر گلاسز کتنے اچھے لگ رہے تھے۔“

مول کو اس کے بارے میں سن کر اسے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ پھر جب وہ ان کے ڈیپارٹمنٹ میں آیا تو اس کی دوستوں نے بطور خاص اسے اسفند کا دیدار کروایا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ واقعی مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ چند دن وہ بھی اپنی دوستوں کے ساتھ اس کے حسن اور پر سنائی کے قصیدے پڑھتی رہی اور اپنی دوستوں کی طرح ڈیپارٹمنٹ میں اس کی آمد کا انتظار کرتی رہتی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس روٹین سے ٹھک آ گئی۔ وہ کیسا نیت پسند نہیں تھی لیکن اپنی دوستوں کی خاطر وہ اب بھی اس کے انتظار میں کھڑی ہوتی تھی کہ وہ ڈیپارٹمنٹ میں کب آتا اور کب جاتا ہے۔ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ اس کلاس کے باہر کھڑی ہوتی کیونکہ اس کی دوست اکیلے وہاں نہیں کھڑی ہو سکتی تھیں اس لیے مول جیسے ’جواں مرد‘ کی موجودگی ضروری تھی۔ اسے مجبوراً ان کے ساتھ جانا پڑتا حالانکہ اس کے انتظار میں بے قوفوں کی طرح آدھ گھنٹہ گزارنا اسے کافی مشکل لگنے لگا تھا۔ لیکن دوستی تو دوستی ہے۔ میں انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ ہر بار یہی سوچتی۔ لیکن وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ ان کا گروپ آہستہ آہستہ لوگوں کی نظروں میں آ رہا ہے۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں ان کے بارے میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ لیکن اس نے اس جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

اس دن وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ لائبریری میں ٹیکسیپیڑ کا ایک ڈرامہ لینے گئی تھی۔ اس ڈرامے کا

بس ایک داغِ ندامت

اور بجٹل ٹیکسٹ بازار میں دستیاب نہیں تھا۔ اور اس نے سوچا کہ جب تک وہ مارکیٹ میں نہیں آتا۔ وہ لائبریری سے اسے الٹو کروا کر پڑھ لے گی۔ جب وہ کاؤنٹر پر اپنی دوست کے ساتھ کتاب الٹو کروانے گئی تو اس نے دیکھا۔ اسفند بھی کچھ کتابیں الٹو کروا رہا ہے۔ اس کی دوست کچھ نروں ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا جھیان بھی اس کی جانب تھا۔ اسی وقت لائبریرین اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ”میکبھ کا اور بجٹل ٹیکسٹ ہے لائبریری میں؟ شیکسپیر کا مشہور ناول ہے۔“ اس نے کچھ نروں سے انداز میں لائبریرین سے پوچھا۔

اسفند نے رجسٹر پر سائن کرتے کرتے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی اس حرکت پر حیران ہوئی۔ کیونکہ اس سے اس کی کوئی جان پہچان نہیں تھی جو وہ اس طرح مسکراتا۔ مول نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے نظر ہٹائی۔

”میکسکیو زمی مس! شیکسپیر نے میکبھ نام کا کوئی ناول نہیں لکھا۔“ لائبریرین کے بجائے اس نے اسفند کو کہتے سنا تھا۔

وہ سرگھما کر پھر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ فوری طور پر مول کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے اپنی دوست پر نظر دوڑائی وہ بھی کچھ حیرت زدہ تھی۔

”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ شیکسپیر کا ناول میکبھ ہمارے سلیبس میں شامل ہے۔“ مول نے قدرے بلند آواز میں اس سے کہا تھا مگر وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔

”آپ کے سلیبس میں شیکسپیر کا کوئی ناول نہیں ہے۔“ اس نے ایک بار پھر کہا۔ اس کا اصرار مول کی سمجھ سے باہر تھا۔

”میں شرط لگا کر کہتی ہوں کہ ہمارے سلیبس میں شیکسپیر کا یہ ناول ہے۔“

اس بار وہ اس کی بات پر ہلکھلا کر ہنس پڑا۔

”چلیں ٹھیک ہے بیٹنگ (شرط) ہی سہی کیوں عمر! کیا شیکسپیر نے اس نام سے کوئی ناول لکھا ہے؟“ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنے پاس کھڑے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس کے دوست نے بڑا مختصر سا جواب دیا تھا۔

”آپ نے سنا۔ عمر نے لڑ پچر میں ماسٹرز کیا ہے لیکن وہ شیکسپیر کے ایسے کسی ناول کو نہیں جانتا۔ اب آپ ثابت کریں کہ شیکسپیر نے اس نام کا کوئی ناول لکھا ہے۔“

وہ اب اس کی باتوں پر جھنجھلائے لگی۔

”آپ کو کچھ نہیں پتا۔ شیکسپیر نے اس نام کا ناول لکھا ہے اور وہ ہمارے سلیبس میں بھی ہے بلکہ آپ ظہریں۔ میں آپ کو سلیبس دکھاتی ہوں۔“

بات کرتے کرتے اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے بگ میں پارٹ ون کا سلیبس موجود تھا۔

سیلیس نکال کر اس نے بڑے فخریہ انداز میں اسفند کے چرے کے سامنے کر دیا۔
 ”اگر آپ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو آپ کو نظر آ جائے گا کہ یہ ناول اس سیلیس میں شامل ہے اور اسے
 شیپ پیڑ نے ہی لکھا ہے۔“

لیکن اسفند نے سیلیس پر نظر دوڑانے کے بجائے اس کے چرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرے بجائے
 آپ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو آپ کو نظر آ جائے گا کہ یہ ناول نہیں play ہے اور شیپ پیڑ ناول نہیں plays لکھتا تھا۔“
 اس کے جھلے پر مومل کو چیسے کرنٹ لگا۔ وہ جانتی تھی کہ شیپ پیڑ نے ناول نہیں plays لکھے ہیں لیکن اس نے نروس ہو کر
 ایک واضح غلطی کی تھی اور بعد میں وہ اسی پراڈی رہی۔ خجالت سے اس کا بُرا حال تھا۔ کسی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے
 وہ لاہریری سے باہر آ گئی۔ اس کی دوست بھی اس کے پیچھے آ گئی باہر آ کر وہ اپنی دوست پر دھاڑنے لگی۔
 ”تمہیں مجھے مہری غلطی کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔ تم منہ بند کر کے سارا تماشا دیکھتی رہیں۔“
 اس کی دوست اپنی منگائی پیش کرنے لگی۔

”یارا مجھے تو خود پتا نہیں تھا۔ مجھے کیا اندازہ کہ وہ کس حوالے سے بات کر رہا ہے ورنہ میں تمہیں کبھی اس
 بحث میں انوالو نہ ہونے دیتی۔ ویسے یارا دیکھو اس نے کس طرح تمہاری غلطی کو پکڑا ہے۔ مگر میں تو حیران ہوں کہ اس
 نے تم سے بات کیسے کر لی۔ مجھ سے بات کرنا تو میں تو فوت ہی ہو جاتی۔“

عالیہ کی بات پر مومل کا پارہ اور چڑھ گیا۔ وہ کافی دیر عالیہ پر برستی رہی خجالت سے اس کا بُرا حال تھا اور اسی
 خجالت کے مارے وہ اگلے دن یونیورسٹی نہیں گئی۔

تیسرے دن جب وہ یونیورسٹی گئی تو اس کی دوستیں اسے دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائی تھیں۔

”تمہارے لیے ایک تحفہ بھیجا ہے اسفند نے۔“

وہ عالیہ کی بات پر حیران رہ گئی۔

سائزہ نے اسے ایک کتاب تمنا دی۔

”تم تو کل آئی نہیں تمہیں مگر اسفند آیا تھا اور یہ ڈرامہ دے کر کہنے لگا کہ اپنی دوست کو یہ ”ناول“ میری طرف

سے دے دیجئے گا۔“

وہ سائزہ کی بات پر یک دم بگڑ گئی۔ ”اور تم نے خاموشی سے یہ کتاب تمام لی۔ وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا اور تم

لوگوں نے ذرا پروا نہیں کی۔“

”صرف کتاب نہیں اس کے اندر ایک خط بھی ہے۔ تمہارے لیے۔ وہ پڑھو پھر غصہ کرنا۔“ فارین نے ہنس کر کہا۔

مومل نے کچھ پریشانی کے عالم میں خط نکالا۔

مائی ڈیئر مومل!

میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ یہ سب کیسے ہوا لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی

بس ایک داغِ ندامت

ہے۔ تم وہ پہلی لڑکی ہو جس سے مجھے محبت ہوئی ہے۔ اب میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو اور اب میں تمہاری جانب سے جواب کا انتظار کروں گا۔ مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔

تمہارا اور صرف تمہارا اسفند

خط پڑھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ”اس کینے کی اتنی جرأت کہ وہ مجھے

اس قسم کے محبت نامے بھیجے۔“

”ہم تو خود اس کو دیکھ کر حیران ہو گئے تھے۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ یہ خط خود جا کر اس کے منہ پر مارتے ہیں

لیکن پھر ہم نے سوچا کہ ہمارا یہ کرنا بہتر نہیں ہو گا جو کچھ کرنا چاہیے۔ تم کو کرنا چاہیے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ تم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو اور ہو سکتا ہے وہ تم سے معذرت بھی کر لے۔ اس وقت وہ کینے میرا میں بیٹھا ہو گا۔ تم وہیں جا کر اس

سے بات کر ڈرا اسے پتا تو چلے کہ تم کیا ہو۔“

اس نے فاریہ کے مشورے پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور سیدھا کینے میرا میں بھیج گئی۔ بڑی آسانی

سے اس نے اسفند کو ہاں پالیا تھا۔ اسفند اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر مسکرایا اور اس کی اس مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مول نے اس کی میز پر بھیج کر کتاب کھینچ کر اس کے منہ پر دے ماری۔

”تم نے کیا سمجھ کر مجھے یہ کتاب دی ہے؟“ وہ بلند آواز میں چلائی۔ اسفند نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا تھا اور

جب اس نے ہاتھ ہٹایا تو خون کے چند قطرے اس کی جھٹلی پر نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ ارد گرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ان کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ ”میں نے یہ play آپ کو اس لیے دیا تھا کیونکہ آپ کو

اس کی ضرورت تھی۔ صرف نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اگر آپ کو یہ بات اچھی نہیں لگی تو آپ بڑے آرام سے یہ کتاب واپس کر سکتی تھیں۔ اس قسم کی بے ہودگی کی ضرورت نہیں تھی۔“

اس نے بہت سرد لہجے میں اس سے کہا تھا مگر اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس

پاس بیٹھے ہوئے لوگوں تک اس کی آواز پہنچے۔ مول پر اس کے لہجے کی سختی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار پھر وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا خط اس پر اچھال دیا۔

”یہ لولیز تم نے کون سے خلوص کے اظہار کے لیے دیا ہے؟“

وہ جیسے اس کی بات پر دم بخود رہ گیا تھا۔ ”میں نے کوئی لولیز نہیں لکھا۔“

”تو کیا یہ تمہارے فرشتوں نے لکھا ہے۔ تم نے کیا سوچا کہ تم مجھے پھنسا لو گے اس طرح کے خط بھیج کر۔“

”میرے پاس ان خرافات کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں یونیورسٹی اس لیے نہیں آتا اور جہاں تک تمہیں

پھنسانے کا تعلق ہے تو مجھے خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو پہلے ہی میرے انتظار میں کھڑی رہتی ہو۔“ اسفند نے بہت تلخ لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

مول کے جسم میں جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے ایک زنا نے کا تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ کینے

بس ایک داغِ ندامت

ٹیبرا میں یک دم جیسے سناٹا چھا گیا۔ اسفند حسن اپنے گال پر ہاتھ جمائے کھڑا تھا اور وہ چلتی چلنے والے انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”اس تھپڑ کے لیے تم ساری عمر بچھتاؤ گی۔“

اسفند نے جھنجھے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ کہا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔

”کیا کرو گے تم؟“ وہ اس کے تاثرات سے خاکف نہیں ہوئی۔

”یہ تم بہت جلد جان جاؤ گی۔“ ٹیلی پر پڑی ہوئی کتابیں اٹھا کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کینے میریا سے نکل گیا۔

مول پر اس کی دھسکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ واپس اپنی دوستوں کے پاس ڈیپارٹمنٹ چلی گئی۔ اور انہیں سارے واقعات سنا دیئے۔

”مومی! تم نے اسے تھپڑ کیوں مارا؟“ فاریہ اس کی بات سن کر چیخ پڑی۔

”کیوں نہ مارتی۔ وہ بے ہودہ بکواس کر رہا تھا۔ کیا میں اتنے لوگوں کے سامنے اپنی رسوائی برداشت کرتی اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا نہ تم لوگ اس کے لیے کلہاڑی کے باہر کھڑی ہوتیں اور نہ مجھے تم لوگوں کے ساتھ جانا پڑتا۔“ وہ اپنی دوستوں پر برس پڑی۔

”مومی!.....! ہم نے تمہارے ساتھ صرف ایک مذاق کیا تھا کیونکہ آج اپیل فول تھا اور تم نے بغیر سوچے سمجھے اتنی بڑی حماقت کر دی۔“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یک دم عالیہ نے اس سے کہا۔ مول کو یوں لگا جیسے اس کے پاس کوئی بم پھٹا ہو۔ اس نے بے یقینی سے فاریہ اور عالیہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”وہ خطا قبلی نے لکھا تھا اسفند نے نہیں، تم نے اس کی پیٹڈ رائٹنگ بھی نہیں پہچانی۔ تم بھی بعض دفعہ حد کر دیتی ہو۔“

مول کا پارہ اس وقت آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنی دوستوں کو بے نقط سنائیں۔ وہ وضاحتیں پیش کرتی رہیں مگر اس نے کوئی وضاحت قبول نہیں کی تھی۔ چند منٹوں پہلے کا منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور اس کی خلیش بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اس کا دل یونیورسٹی میں نہیں لگا تھا۔ دوستوں کے روکنے کے باوجود وہ وہاں نہیں رکی اور پوائنٹ کی طرف چلی گئی۔ اپنے گھر کے پاس وہ حسب معمول بس سے اترتی تھی اور پھر مین روڈ سے بائی روڈ پر مڑ گئی۔ اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے سفید رنگ کی اس ہوٹل پر بھی غور نہیں کیا تھا جس نے گھر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ گھر آ کر بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی اس کا ضمیر اسے مسلسل لعنت ملامت کر رہا تھا۔

”میں نے غلطی کی اور ٹھیک ہے۔ میں کل اسفند سے معذرت کر لوں گی۔“

بس ایک داغِ ندامت

رات کو سونے سے پہلے اس نے فیصلہ کیا تھا اور پھر بڑی جدوجہد کے بعد سونے میں کامیاب ہو گئی۔
انگلے دن صبح حسب معمول تیار ہوئی تھی اور مقررہ وقت پر پوائنٹ پکڑنے کے لیے گھر سے باہر بائی روڈ پر آ گئی۔ وہ ابھی مین روڈ سے کافی دور تھی جب بہت تیزی سے ایک گاڑی یک دم اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اس نے حیران ہو کر اس سیاہ رنگ کی گاڑی کو دیکھا جس کا فرنٹ ڈور کھلا تھا۔ اور سفید شلوار قمیض میں لمبوس ایک دراز قد نوجوان اس کے قریب آ گیا تھا۔

”آپ مول عباس ہیں؟“ بہت مشتہ لہجے میں اس سے پوچھا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے وہ صرف اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”تعارف کی ضرورت نہیں ہے آپ بس اتنی زحمت کریں کہ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سڑک پر آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی جائے۔“

مول اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن کر دھک سے رہ گئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر دو اور لمبے بڑے آدی اس کے اطراف میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا جسم کلپٹے لگا۔ فن ہوتی ہوئی رنگت کے ساتھ اس نے کسی مدد کی آس میں سڑک کو دیکھا تھا۔

”اگر آپ کو یہ امید ہے کہ سڑک سے کوئی گاڑی گزرے گی اور آپ شور مچا کر اسے متوجہ کر لیں گی تو ایسا نہیں ہوگا۔ اس بائی روڈ کے دونوں اطراف میں دو گاڑیاں ہیں اور وہ کسی کو بھی اس وقت تک اس سڑک پر آنے نہیں دیں گی۔ جب تک ہم یہاں سے چلے نہیں جاتے اس لیے آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔“

اس بار اس کا لہجہ بے حد سخت تھا۔ اس نے مول کے اطراف کھڑے ہوئے آدیوں کو کوئی اشارہ کیا تھا اور ایک آدی نے اسے گاڑی کے دروازے کی طرف دیکھ لیا دیا تھا دوسرے آدی نے کہیں سے ایک ریو لوور برآمد کیا تھا اور اس پر تان دیا۔ سفید شلوار قمیض والا نوجوان کچھ کہے بغیر پڑ سکون انداز میں دوبارہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈوسٹے ہوئے دل کے ساتھ وہ بھی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ وہ دونوں آدی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ دائیں طرف بیٹھے ہوئے آدی نے اپنی جیب سے ایک سیاہ پٹی نکال کر اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ اسے پوری دنیا اندھیرے میں ڈوبتی محسوس ہوئی۔

”تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟“ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔

”آپ کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔“ اس نوجوان کی آواز ابھری تھی۔

”میرے بھائیوں کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سرکاری افسر ہیں۔ کوئی معمولی آدی نہیں ہیں۔“ اس نے انہیں دھمکانے کی کوشش کرنا چاہی تھی۔

”اچھا۔“ جواب ایک بار پھر مختصر تھا۔ مول کا دل رونے کو چاہا۔

”تم مجھے اسفند کے پاس لے کر جا رہے ہو؟“ اس نے ایک بار پھر پوچھا۔ گاڑی میں اس بار خاموشی رہی۔ اس کا ٹک بلیٹن میں بدل گیا۔ اس نے آنکھوں سے پٹی ہٹائی چاہی مگر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہ پٹی اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔“ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آڈی نے بلند آواز میں کہا۔

”اب ایسا کرے تو اس کے منہ پر تھپڑ مارنا۔“ اسی نوجوان نے کراخت آواز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آڈی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ موئل نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا۔ وہ دوبارہ ہاتھ پٹی تک لے جانے کی ہمت نہیں کر پائی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زور زور سے پیچھے دھاڑیں مارا کر روئے لیکن وہ اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

پہلی دفعہ اسے صحیح معنوں میں اپنے کیے پر پچھتاوا ہوا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر سکی گاڑی کتنی دیر چلتی رہی۔ اس کے لیے گویا یہ قیامت کا سفر تھا۔ پھر گاڑی رک گئی تھی۔ اس کا دروازہ کھولا گیا اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی سے اتارا۔ موئل نے دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی پٹی اتارنی چاہی مگر ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا گیا۔

”اسے ابھی آنکھوں پر ہی رہنے دو۔“ اس نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہا تھا پھر اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ اسے کسی گھر کے اندر لے گیا۔ موئل کو بار بار دروازے بند ہونے اور کھلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اچانک اس نے موئل کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی پٹی اتار دی۔ چند لمحوں تک موئل کو کچھ نظر نہیں آیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اردگرد کا منظر واضح ہونے لگا۔ اس کے پاس کھڑا نوجوان بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ موئل کو اس کی نظروں سے خوف آنے لگا۔

”تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ چند قدم پیچھے بیٹھے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

”میں کون ہوں۔ تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں۔ یہ جاننے کے لیے تم کچھ دیر انتظار کرو۔“

وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے گئی اور دروازے کے پینڈل کو گھمانے لگی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ شاید وہ اسے باہر سے لاک کر گیا تھا اور یہ چیز اس کے لیے خلاف توقع نہیں تھی۔ پھر اس نے دروازہ کا پینڈل چھوڑ دیا۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ شاید وہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ وہ ایک کشادہ اور ویل فرنشڈ کمرہ تھا۔ کمرے کی ایک دیوار میں اسے کھڑکیاں بھی نظر آئیں۔ وہ تیزی سے ان کی طرف گئی اور پردے کھینچ کر وہ ایک بار پھر مایوس ہو گئی تھی۔ کھڑکیوں کے باہر گرل گئی ہوئی تھی اور کھڑکیوں سے نظر آنے والے منظر نے اسے ہولا دیا تھا۔ اسے شہر سے باہر کسی فارم ہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ باہر دو روٹ تک کھیت بہزہ اور درخت نظر آ رہے تھے۔

اس نے بے اختیار روٹا شروع کر دیا اور اس بار اس نے اپنی آواز دبانے کی کوشش نہیں کی۔ کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگاتے ہوئے وہ بلند آواز میں روتی رہی مگر اس کی آوازیں اندر نہیں آ پاتا تھا۔ وہ پھر کا کھانا وہی سفید شلوار میٹھی والا نوجوان لے کر آیا تھا اور خاموشی سے اندر رکھ کر چلا گیا وہ روتے ہوئے اس کے پیچھے گئی مگر وہ تیزی

بس اک داغِ ندامت

سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک زور زور سے دروازہ بجاتی رہی۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب رہا تھا کہ جب گھر میں اس کی گمشدگی کا پتا چلے گا تو کیا ہوگا۔ روتے روتے خود ہی اس کے آنسو ختم گئے تھے۔ وہ سر پکڑ کر ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔

شام کے ساتھ بیچے اس نے ایک بار پھر دروازہ کے باہر قدموں کی چاپ سنی تھی دروازہ کھلا تھا اور ایک آدمی کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وہی نوجوان تھا۔ اس آدمی نے میز پر کھانے کی ٹرے رکھ دی اور اس پر پہلے سے موجود دوپہر کے کھانے کی ٹرے اٹھائی۔

”آپ نے کھانا نہیں کھایا؟“ اس نوجوان نے بہت نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔ مول کو اس کے لہجے سے جیسے شل گئی۔ وہ بلند آواز سے بولنے لگی۔

”مجھے کھانا نہیں کھانا۔ گھر جانا ہے۔ تم مجھے گھر جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔“ مول نے دم کمرے کے دروازے سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کا نتیجہ ایک زبردست تھپڑ کی صورت میں نکلا تھا۔

”میں عام طور پر عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا مگر بعض عورتوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ جیسے تمہارے لیے۔ تمہیں یہاں جس شخص کے کہنے پر لایا ہوں، صرف وہی تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے تم اپنا شور مچا کر بند کرو۔ جس جگہ پر تم ہو یہاں میرے علاوہ تین اور آدمی ہیں اور تینوں میں سے کوئی بھی تمہارا ہمدرد نہیں ہے اس لیے کسی سے مدد کی توقع مت رکھو۔“

وہ حلق میں اٹکے ہوئے سانس کے ساتھ دہشت زدہ اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ اپنی بات ختم کر کے اس آدمی کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ اسے ایک بار پھر رونا آ گیا تھا۔

”پتا نہیں، گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ پتا نہیں بھائی مجھے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“ اس کا ذہن جیسے سوچوں کا گرداب بن گیا تھا۔

تیسری دفعہ کمرے کا دروازہ رات گیا رہ چکے کھلا تھا اور آنے والے کو دیکھ کر اس کا سانس رک گیا تھا۔ اسے شک تو تھا کہ اسے اسفند کے کہنے پر غوا کیا گیا ہے مگر غوا کرنے والوں نے اس کی بات کی نہ تصدیق کی تھی نہ تردید۔ اس لیے اس کا شبہ یقین میں نہیں بدلا تھا یا شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اسفند حسن جیسا شخص ایسی گھٹیا حرکت کر سکتا تھا۔ اور اب..... اب اسفند حسن اس کے سامنے تھا۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا یوں جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ سستے ہوئے چہرے، مومجھی آنکھوں اور غنڈے ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ اسے کمرے میں آتا دیکھتی رہی۔

”تو مول عباس! کوئی بات کریں۔ کچھ کہیں۔ میرے عشق میں کتنی طاقت تھی جو آپ کو یہاں سمجھنے لایا ہے۔“

اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور لہجے میں زہر تھا۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کرو۔ مجھے گھر جانے دو۔“ وہ ایک دم گھٹنوں کے بل گر

بس ایک داغِ ندامت

کے رونے لگی۔

”میں گھر بھجوا دوں گا۔ تمہیں اپنے پاس رکھ کر مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ ہاں بس جب تم واپس جاؤ گی تو اتنی ہی ذلت اور رسوائی ساتھ لے کر جاؤ گی۔ جتنی کل میں یونیورسٹی سے لے کر گیا تھا۔“ وہ اس کے قریب آ گیا۔

”جو کچھ میں نے کل کیا، وہ غلط تھا۔ مجھے اس پر افسوس ہے میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”جو کچھ میں آج کروں گا، مجھے اس پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ تم اس کی مستحق ہو۔“

مول نے روتے روتے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ اس کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ نہیں سکی۔ فرار آسان نہیں ہوتا نہ زندگی سے نہ قسمت سے نہ ان حرکتوں سے جو ہم خود کو محفلِ کل سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہر شخص کو گرنے کے لیے ٹھوکر کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض ٹھوکر لگے بغیر ہی گر جاتے ہیں پھر انہیں اٹھانے کے لیے کوئی ہاتھ بڑی مشکل سے ہی آگے بڑھتا ہے۔

وہ صبح بے حد خاموشی سے باہر چلا گیا تھا اور اندر وہ دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ اس رات کے بعد وہ دوبارہ اس کے پاس نہیں آیا۔ تیسرے دن وہ صبح کے وقت آیا اور وہ اسے دیکھ کر ایک بار پھر خوفزدہ ہو گئی۔

”تم کھانا کیوں نہیں کھاتیں؟“ اس کا لہجہ اور انداز دونوں بدلے ہوئے تھے۔

”مجھے گھر جانے دو۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ خدا کے لیے مجھے گھر جانے دو۔“ اس نے روتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ٹھیک ہے اگر تم گھر جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ مگر پہلے تم کھانا کھاؤ اور کپڑے تبدیل کر لو۔“

وہ ایک پیکٹ اس کی طرف اچھال کر چلا گیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے کپڑے بدل کر کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ چند لمحے زہر مار کرنے کے بعد وہ پھر اٹھ گئی۔ اس کے بعد وہ کسی کی آمد کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی نہیں آیا۔ اگلی صبح اسے اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھر سے لے جایا گیا۔ اور پھر اس کو گھر کے پاس چھوڑ دیا گیا۔

مول بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی اور فاطمہ جیسے سکتہ کے عالم میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اب مول کو چپ کروانے کی کوشش کرتی۔ ربیعہ بھی گم صدم تھی۔ پھر اچانک فاطمہ بھی مول سے لپٹ کر رونے لگی شاید اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ ربیعہ کچھ دیر تک ان دونوں کو روتے دیکھتی رہی پھر اس نے نرمی سے فاطمہ کو مول سے علیحدہ کیا تھا۔

”مول! تم چپ ہو جاؤ۔ رونے سے کیا ہوگا۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ وہ ماضی ہے اب آئندہ کا سوچو، تمہارے آگے پوری زندگی پڑی ہے۔ دنیا ختم تو نہیں ہو گئی۔“

”کیا میری دنیا ختم نہیں ہو گئی؟“ مول نے روتے روتے سر اٹھا کر اس سے کہا۔ اس کی شکل دیکھ کر ربیعہ کے دل کچھ ہوا مگر اس نے ایک بار پھر خود پر قابو پا لیا۔

”مول! خود کو سنبھالو۔ جو کچھ ہو چکا ہے، اسے تم نہیں بدل سکتیں مگر جو زندگی آئندہ تمہیں گزارنی ہے۔ اس کے بارے میں تو سوچ سکتی ہو۔“

”زندگی؟ کون سی زندگی؟ میرے گھر والوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ کوئی رشتہ دار مجھے پناہ دینے کو تیار نہیں۔ میری بات پر کسی کو اعتبار ہی نہیں آتا۔“

ربیعہ نے اس کی بات پر ایک طویل سانس لی۔

”مول! صرف رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔ ہم تمہارے گھر والوں سے بات کریں گے۔ ہم یہ نہیں بتائیں گے کہ تمہارے ساتھ کوئی غلط حرکت ہوئی ہے۔ یہ نہیں گے کہ تمہیں کسی اور لڑکی کے دھوکے میں اغوا کیا گیا تھا اور جب اغوا کرنے والوں کو حقیقت کا پتا چلا تو انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا۔“

”اور اگر انہوں نے پھر بھی مجھے نہ رکھا تو؟“ مول نے ربیعہ سے پوچھا۔ وہ فاطمہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”تو پھر کچھ نہیں۔ ہم لوگ تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں بڑک پر نہیں پھینکیں گے۔“

ربیعہ نے قطعی لہجے میں کہا۔ مول حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی کہ یہ بات فاطمہ کبھی تو شاید اسے حیرت نہ ہوتی لیکن ربیعہ کے منہ سے یہ بات اسے بڑی عجیب لگی تھی۔ اس کی ربیعہ سے صرف سرسری سی جان پہچان تھی۔ وہ فاطمہ سے ملنے آتی اور ربیعہ سے بھی سلام دیا ہوا جانتی کیونکہ وہ فاطمہ کی روم میٹ تھی اور اس کی بہت اچھی دوست بھی تھی اور اس وقت وہ اس کے لیے جیسے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھی۔ اس نے زبردستی مول کو کھانا کھلایا تھا اور پھر اسے نیند کی گولی دے کر سلا دیا۔ پھر وہ فاطمہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”اب کیا ہوگا ربیعہ! اب کیا ہوگا؟ مول زندگی کیسے گزارے گی؟ کیسے رہے گی؟“ فاطمہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا تھا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے اور افسوس کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تم اب اس کے سامنے رونا مت۔ تمہارے آنسو اسے اور ڈپریشن کر دیں گے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ہم اسے بدل نہیں سکتے لیکن اسے تسلی اور دلاسا تو دے سکتے ہیں۔ بار بار روہی بات دوہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ صبح ہم ہاسٹل جانے سے پہلے اس کے گھر جائیں گے اور اس کی بھابیوں سے بات کریں گے۔ ہو سکتا ہے وہ اسے رکھنے پر تیار ہو جائیں ورنہ دوسری صورت میں ہم اسے کسی ہاسٹل میں داخل کروا دیں گے۔ کچھ روپے میرے پاس ہیں اور کچھ تم دے دینا۔ ہم بہت آسانی سے اس کے اخراجات اٹھا سکتے ہیں پھر وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے گی تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔“

ربیعہ نے جیسے سب کچھ پہلے سے طے کر رکھا تھا۔ فاطمہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

دوسرے دن وہ مول کے گھر گئیں لیکن مول کی بھابیوں کے چہرے کے تاثرات نے انہیں بتا دیا کہ وہ اب مول کی کسی دوست سے ملنا نہیں چاہتیں اور جب انہیں ان کی آمد کا پتا چلا تو وہ ایک دم غضب ناک ہو گئیں۔ ان کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ وہ اپنے سارے دلائل دل میں لیے واپس آ گئیں۔ جب مقابلہ بات کرنے پر تیار نہ ہو تو اسے قائل

بس ایک داغِ ندامت

کرنا تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ مجھے دل کے ساتھ انہوں نے موئل کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ زرد پھرے کے ساتھ گم صدمہ ان کی باتیں سنتی رہی۔

”ان کا قصور نہیں ہے۔ وہ بھی مجبور ہیں اگر مجھے گھر میں رکھیں گی تو خاندان والے ان کا جینا حرام کر دیں گے اور بھائی تو شاید مجھے قتل ہی کر دیں۔“

”وہ مجبور نہیں ہیں۔ ڈرامہ کر رہی ہیں۔ صرف تم سے جان چھڑانا چاہتی ہیں اگر یہ ان کی اپنی بیٹی کے ساتھ ہوا ہوتا تو کیا وہ اسے بھی اسی طرح گھر سے نکال دیتیں۔“

رہیجہ غصے میں آگئی تھی اس کی بات سن کر۔

”یہ سب اس ذلیل شخص کی وجہ سے ہوا ہے اگر وہ یہ سب نہ کرتا تو کوئی مجھے گھر سے نکال نہیں سکتا تھا۔“ وہ جانے کس طرح خود پر ضبط کیے بیٹھی تھی مگر رہیجہ کی بات نے اسے پھر رلا دیا۔ فاطمہ اسے چپ کروانے لگی۔

ایک ہفتے تک وہ اسی طرح رہی تھی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بغیر کسی وجہ کے رونا شروع کر دیتی اور کبھی اسفند کو گالیاں دینے لگتی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے نارمل ہونا شروع کر دیا۔ ایک ورکنگ وہ بن ہاسٹل میں رہیجہ نے اسے کمرہ لے دیا اور اس نے ایک بار پھر اپنی تعلیم پر توجہ دینے کی کوشش کرنی شروع کر دی۔ یونیورسٹی جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی اور پھر وہاں وہ شخص اسفند حسن بھی ہوتا اور اس کا وجود اسے خوف میں مبتلا کیے رکھتا۔ اس نے پرائیویٹ طور پر امتحان دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ رہیجہ اور فاطمہ تقریباً ہر روز اس کے پاس آتی تھیں اور پھر باتیں کر کے اس کا دل بہلایا کرتیں۔ کبھی وہ اسے اپنے ساتھ گھمانے کے لیے لے جاتیں۔ ان دونوں کا وجود اس کے لیے بہت سکون بخش تھا۔ اسے بعض دفعہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ دونوں اس پر اتنی توجہ اتنی محبت کیوں دے رہی تھیں۔ وہ اس کے گھر والوں اور دوسرے دوستوں کی طرح بھاگی کیوں نہیں۔ انہوں نے اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ بہر حال وہ ان کی ذمہ داری تو نہیں تھی اور نہ ہی ان پر اس کا کوئی حق تھا مگر ساری سوچیں اس کے وجود کو ان دونوں کے احسانوں کے قرض میں جکڑ دیتیں۔

ان ہی دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ شروع میں اس نے اتنا دھیان نہیں دیا مگر رہیجہ ایک دن اسے زبردستی ہاسپٹل لے کر گئی اور اس کے ٹیسٹ کروائے اور ٹیسٹوں کی رپورٹس نے ان تینوں پر جیسے سکتہ کر دیا تھا۔ موئل پر ٹیکٹ تھی۔ جس حادثے کو وہ بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی وہ ایک بار پھر ایک بھیا تک سچائی کی طرح اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”رہیجہ! اب کیا ہوگا؟“ کسی ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح وہ ایک بار پھر رہیجہ کو پکار رہی تھی۔ رہیجہ بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ ہر قدم پر اس کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔

”تم پریشان مت ہو موئل! میں کچھ سوچوں گی کہ تمہیں اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا دلایا جائے۔“

رہیجہ اور فاطمہ اسے تسلیاں دیتی ہوئی واپس آ گئیں۔

”رہیہ! اب کیا ہوگا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ فاطمہ نے ہاسٹل واپس آتے ہی سر پکڑ لیا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم اسے ایسے ہی تو نہیں چھوڑ سکتے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کریں کیا؟“ رہیہ بھی اسی کی طرح الجھی ہوئی تھی۔

”رہیہ! رہیہ، کیوں نہ ہم اس لڑکے کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ وہ مول سے شادی کر لے۔“

رہیہ حیرانی سے فاطمہ کی بات پر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”کس قدر احمقانہ خیال ہے تمہارا۔ وہ اس قدر رحم دل ہوتا تو یہ سب کچھ کرتا کیوں؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہمارے کہنے پر وہ شادی پر تیار ہو جائے گا۔“

”رہیہ! کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری بات مان جائے اور اگر وہ نہ مانا تو کم از کم ہم اسے اس بات پر مجبور کریں گے کہ مول کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلوائے۔ ہم اسے دھمکی دیں گے کہ ہم یہ معاملہ اس کے گھر لے کر جائیں گے۔“ رہیہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ہمارے پاس تو اتنے روپے نہیں ہیں کہ ہم اس کو چھٹکارا دلا سکیں۔ مگر وہ تو مول کی مشکل حل کر سکتا ہے ذرا سوچو تو؟“ وہ رہیہ کو قائل کرنے پر تلی تھی۔

”تمہاری یہ تجویز کتنی موثر ثابت ہوتی ہے میں نہیں جانتی مگر ٹھیک ہے ایک بار ٹرائی کر لیتے ہیں۔“ رہیہ نے بے دلی سے کندھے اچکا دیئے۔

اگلے دن وہ دونوں یونیورسٹی چلی گئیں۔ مختلف ڈپارٹمنٹس سے اس کے بارے میں پوچھتے پوچھتے وہ اس تک پہنچ ہی گئیں۔ وہ لائبریری میں بیٹھا تھا۔ چند لمحوں تک وہ بھی اس پر سے نظر نہیں ہٹا سکیں۔ وہ واقعی خطرناک حد تک مردانہ حسن کا مالک تھا۔ اور کسی لڑکی کا اسے دیکھ کر اس پر فدا ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔

”آپ کا نام اسفند حسن ہے؟“ رہیہ نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

اس نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔ ”ہاں۔“

”ہمیں آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“

رہیہ کی بات پر اس نے کندھے اچکا تے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے کریں۔“

”دیکھیں آپ پلیز باہر آ کر ہماری بات سن لیں۔ ہم ان کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتے۔“ رہیہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوستوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اٹھ کر ان کے ساتھ باہر آ گیا۔ رہیہ نے باہر آنے کے بعد مختصر لفظوں میں اپنا اور فاطمہ کا تعارف کرایا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔

”ہم آپ سے مول کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔“ تعارف کرواتے ہی رہیہ بلا توقف اصل موضوع پر آ گئی۔ اسفند کے چہرے کا رنگ یک دم بدل گیا۔

بس ایک داغِ ندامت

”اس کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟ اور آپ کا اس سے کیا تعلق ہے۔“ اس نے سرد لہجے میں ان سے پوچھا تھا۔

”اس سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ اسے جان کر آپ کیا کریں گے۔ ہم تو آپ کو صرف یہ اطلاع دینے آئے ہیں کہ وہ پریگنٹ ہے۔“

”کیا؟“ ربیحہ کی بات پر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا اور چند لمحوں کے بعد اس نے ہی نہیں پایا۔
”اتنی حیرت کس بات پر ہے آپ کو؟ جو کچھ آپ نے کیا تھا۔ کیا اس کے بعد ایسی کوئی خبر حیرت انگیز ہو سکتی ہے؟“

رہیجہ کا لہجہ بے حد کٹھن تھا۔ وہ اس کی بات پر چند لمحوں تک کسی سوچ میں گم رہا اور پھر اس نے ایک دم تیز آواز میں کہنا شروع کر دیا۔

”میں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟ یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ آپ کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جو ہوا وہ اس کی مستحق تھی۔ اب اگر وہ پریگنٹ ہے تو یہ اس کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ اس لیے مجھے اس اطلاع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کو میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ بچہ جائز ہے یا ناجائز۔ اولاد تو تمہاری ہی ہے۔ پھر سارے نقصان وہ اکیلی کیوں برداشت کرے۔ تم اس سے شادی کرو۔“ فاطمہ یک دم بیچ میں بولنے لگی تھی۔

”آپ پاگل ہو گئی ہیں۔ میں اور اس سے شادی کروں یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اسفند کا لہجہ قسطنطنیہ تھا۔
”ٹھیک ہے پھر ہم اسے تمہارے گھر بھجوا دیں گے تاکہ وہ تمہاری فیملی کو تمہارے کرتوتوں کے بارے میں

بتائے۔“ فاطمہ کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا تھا۔

”تم لوگ ایسا نہیں کر سکتیں۔“

”کیوں نہیں کر سکتے اگر تم کسی کی زندگی تباہ کر سکتے ہو تو ہم کیا کسی کو یہ سب بتا نہیں سکتے۔ تمہیں بھی پتا چلنا چاہیے، ذلت اور رسوائی کیا ہوتی ہے۔“ فاطمہ ایک بار پھر بول اٹھی تھی۔

”دیکھو۔ میری منگنی ہو چکی ہے اس سال کے آخر میں میری شادی ہونے والی ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اگر میری فیملی کو یہ سب کچھ پتا چل گیا، تب بھی میں ان کی نظروں سے گزر رہا ہوں گا۔ وہ میری شادی وپس کریں گے۔ وہ مول کو میری بیوی کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لیے تم اس حوالے سے مجھے ہلکے سے مت کرو۔

مگر ہاں ٹھیک ہے۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے میں اس کا تاوان دے سکتا ہوں۔ اسے جتنے روپے کی ضرورت ہے وہ لے لے اس مصیبت سے چھٹکارا پالے میں اب اس کی طرف یہی مدد کر سکتا ہوں۔“

اسفند کے لہجے میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کی آواز اب بہت دھیمی ہو چکی تھی۔

”اسفند! کبھی انسان بن کر سوچو تو تمہیں خیال آئے گا کہ تم جسے مارنے کی بات کر رہے ہو وہ تمہاری اپنی

بس ایک داغِ ندامت

اولاد ہے، اپنی اولاد کو تو صرف سناپ کھانا ہے مگر وہ بھی اسے دنیا میں ضرور آنے دیتا ہے۔ تم تو سناپ سے بھی گئے گزرے ہو۔ تمہاری وجہ سے ایک لڑکی کی زندگی برباد ہوئی ہے اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ درد کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ ہم نے اسے سہارا دیا ہے مگر کب تک؟ اور تم ایک بات یاد رکھنا ہم نے اسے سہارا ضرور دیا ہے۔ مگر تمہاری اولاد کو نہیں دیں گے۔ ابا رشن تو ہم اس کا کبھی نہیں کروائیں گے۔ تمہاری زندگی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تو ہونا ہی چاہیے اس دنیا میں جو میں بچپن سال بعد تمہارا گریبان پکڑ کر تم سے پوچھے کہ کیا تم انسان ہو؟ نا جائز بچوں کو جب لوگ نام نہیں دیتے تو وہ کیا بن جاتے ہیں یہ تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔ اور ایک بار سوچو۔ بیٹی پیدا ہوئی تو تم کیا کرو گے۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ٹھوکریں کھاتی پھرے گی اور اگر اسے بھی تمہاری طرح کے لوگ ملنے لگے تو کیا ہوگا۔ کبھی سامنا ہونے پر کیا تم شرم سے ڈوب نہیں مرو گے۔ ایک بار اس بھیا تک دل کے بغیر سوچو۔ لوگ اپنی اولاد کے لیے کیا کیا کرتے ہیں اور تم کیا کر رہے ہو؟“

وہ ربیعہ کی باتوں پر نظریں زمین پر جمائے خاموش کھڑا رہا۔ ربیعہ نے مزید کچھ نہیں کہا اور فاطمہ کے ساتھ واپس ہاسٹل آ گئی۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ شادی پر تیار ہوگا؟“ ہاسٹل واپسی پر فاطمہ نے ربیعہ سے پوچھا۔

”پتا نہیں، بہر حال اگر وہ شادی پر تیار نہ ہو تو میں اس سے کہوں گی کہ وہ مول کا ابا رشن خود کراوے۔ یہ کام ہم نہیں کریں گے۔“ ربیعہ کو جھکن محسوس ہو رہی تھی۔

شام کے وقت ربیعہ کا فون آیا تھا۔ وہ وارڈن کے کمرے میں فون سننے لگی اور جیسے حیرت سے جم کر رہ گئی تھی۔ فون پر اسفند حسن تھا کسی تمہید کے بغیر اس نے کہا تھا۔

”میں مول سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔“

ربیعہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ”لیکن میں فی الحال اس شادی کا اعلان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں ابھی اپنے والدین سے کوئی جھگڑا افرود نہیں کر سکتا۔ چند ماہ بعد میں پیرز سے فارغ ہو جاؤں گا۔ تب میں اپنی فیملی کو شادی کے بارے میں بتا دوں گا۔ ابھی میں اس سے نکاح کر لیتا ہوں۔ میرے دوست کا ایک فلیٹ ہے، وہ چاہے تو وہاں شفٹ ہو جائے۔ آپ لوگ نکاح کی تاریخ طے کر لیں اور مجھے انعام کر دیں۔“

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ربیعہ کو اپنا فون نمبر اور موبائل نمبر لکھوایا تھا۔ ربیعہ کی ساری جھکن جیسے غائب ہو گئی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی واپس کمرے میں آئی تھی اور یہ خبر سن کر فاطمہ کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ اس رات وہ دونوں بڑے سکون سے سوئی تھیں کیونکہ انہیں لگ رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

☆

ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تھی۔ دوسرے دن جب انہوں نے مول کے ہاسٹل جا کر اسے یہ خبر سنائی تو وہ جیسے تھمے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔ ”میں جانتی ہوں، میں تم لوگوں پر بوجھ ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے اس شخص

بس ایک داغِ ندامت

کے سرھونپنے کی کوشش کرو جو میری بربادی کا ذمہ دار ہے۔ تم اگر مجھ سے ٹھگ آ گئی ہو تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو میں کہیں چلی جاؤں گی۔ لیکن مجھے دوبارہ پلیٹ میں رکھ کر اس شخص کے سامنے پیش کرنے کی کوشش مت کرو۔“

ربیعہ اور فاطمہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ انہیں اس سے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

”دیکھو مول! تم ایڈوشنل (جدباتی) ہو رہی ہو۔“ ربیعہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس نے ربیعہ کی بات کاٹ دی۔

”میں نہیں تم لوگ ایڈوشنل ہو رہے ہو۔ میں جس شخص کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس کی بیوی بن کر کیسے رہ سکتی ہوں۔ میں اس سے شادی کرنے کے بجائے جان دینا زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔ میرے دل میں اس کے لیے کتنی نفرت ہے یہ تم بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ وہ اذیت وہ تکلیف وہ ذلت صرف مجھے اٹھانی پڑی تھی۔ وہ تمہارے ساتھ ہوا ہوتا تو پھر میں تم سے پوچھتی۔“

”مول! میں جانتی ہوں تم اس سے بہت نفرت کرتی ہو لیکن اپنے بچے کے بارے میں سوچو۔“

”ربیعہ! میں کیوں سوچوں اس کے بارے میں۔ وہ جہنم میں جائے۔ مجھے کسی بچے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہر قیمت پر اس سے چھٹکارا حاصل کر لوں گی چاہے تم لوگ میری مدد کرو یا نہ کرو۔“

”مول! تم اپنے بچے کو مار ڈالو گی؟“

”اس کے باپ نے بھی تو مجھے مار ڈالا تھا۔ کیا اس نے مجھ پر رحم کھایا تھا پھر میں اس پر رحم کیوں کروں؟ میں اپنی آستین میں ایک اور سانپ کیوں پالوں؟“ اس کے پاس ربیعہ کی ہر بات کا جواب تھا۔

”اتنی دیر سے تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ اب تم ہماری بات سنو۔ اپنی تباہی کی ذمہ دار تم خود ہو۔“ فاطمہ نے یک دم بولنا شروع کر دیا۔ مول کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”فاطمہ! یہ تم کہہ رہی ہو؟“

”ہاں یہ میں کہہ رہی ہوں۔ تم نے کیوں اپنی دوستوں کے کہنے پر اس سے لڑنا شروع کر دیا تھا؟ کیوں اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا؟ اگر تم ایک فضول سی بات پر اس سے جھگڑا مول نہ لیتیں تو آج اس حالت میں نہ ہوتیں۔ تمہیں اپنی ذلت اور رسوائی کا احساس ہے لیکن اسٹند کے لیے کیا کہو گی۔ عزت صرف عورت کی نہیں ہوتی۔ مرد کی بھی ہوتی ہے۔ تم نے بھی اسے ذلیل کیا تھا اور تمہاری پہل نے ہی اسے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ تمہاری دوستوں نے تمہیں ایک غلط بات پر اکسایا۔ تم نے فوراً وہ کام کر ڈالا۔ ہم تمہیں سیدھا راستہ دکھا رہے ہیں۔ تمہاری سمجھ میں ہماری بات نہیں آ رہی۔ مجھے لگتا ہے۔ تمہیں ابھی بھی عقل نہیں آئی۔ تم نے اپنی غلطی سے کچھ نہیں سیکھا۔ تمہیں اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع مل رہا ہے اور تم اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتیں۔ اسٹند نے اگر تمہیں اغوا کر کے ذالت کا ثبوت دیا تھا تو اپنے بچے کو مار کر تم کون سی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کر رہی ہو؟“ فاطمہ بہت غصے میں تھی مگر مول یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اعلا طرف ہوں ہی نہیں تو اعلا ظرفی کا مظاہرہ کہاں سے کروں۔ میں اس سے شادی تو کسی قیمت پر

بس ایک داغِ ندامت

نہیں کروں گی ہاں تم لوگوں کا بوجھ ختم کرنے کے لیے خود کو ختم کر لیتی ہوں۔“ وہ تیزی سے کمرے کی کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چھلانگ لگاتی رہیہ نے اسے پکڑ لیا تھا اور زوردار چھپڑ مار کر دوڑ چکھیل دیا۔ ان دونوں کے پیسے ہوش اڑ گئے تھے۔

”تم یہ صلہ دے رہی ہو ہمیں؟ تمہاری وجہ سے ہماری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور تم ہمارے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنا چاہتی ہو تاکہ ہمارا کیریر ختم ہو جائے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ہم تمہارا مستقبل بچانا چاہتے ہیں اور تم ہمارا مستقبل تباہ کرنا چاہتی ہو؟“

پھوٹی ہوئی سانس کے ساتھ کھڑکی بند کرتے ہوئے رہیہ نے اس سے کہا تھا۔ مول یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”آئی ایم سوری میں نے سوچا نہیں تھا کہ میری خودکشی کا نتیجہ تم لوگوں کے لیے اتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ تم دونوں کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں کل صبح ڈالامان چلی جاؤں گی۔“

رہیہ اس کی بات پر ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ ”وہاں جا کر کون سی امان مل جائے گی تمہیں؟ وہاں تو اس سے بھی بڑے درندے ہیں وہاں کس کس سے بچو گی۔“

”تو میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“ اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئی تھیں۔

”مول! تمہیں اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع مل رہا ہے پھر اس کو کیوں گنوارہی ہو۔ ہم تم سے یہ تو نہیں کہہ رہے کہ تم ساری عمر اس کے ساتھ بندھی رہنا۔ ہم تو یقینی طور پر اس سے شادی کا کہہ رہے ہیں کم از کم فی الحال تو یہ آئی تمہارے تحفظ کا واحد ذریعہ ہے بعد میں تم اس سے طلاق بھی لے لو تو بھی کوئی تم پر اب کی طرح انگلی نہیں اٹھا سکے گا اور تمہارے بچے کو بھی اس کا نام ملے گا اور تم طلاق لیتے ہوئے اس کو چھوڑنا چاہو تو اس کے باپ کے پاس چھوڑ سکتی ہو۔ لیکن کم از کم فی الحال تو اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچاؤ۔“

وہ بے بسی سے ان دونوں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”اگر تمہیں ہم سے ذرا بھی محبت ہے تو تم ہماری بات مان لو۔“ فاطمہ نے بات کرتے ہوئے اس کے آگے

ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تقام لیا۔

☆

دو دن بعد اسٹند کے دوست کے فلیٹ پر اسٹند کے ساتھ اس کا نکاح ہو گیا تھا۔ سارے انتظامات اسٹند نے ہی کیے تھے۔ رہیہ اور فاطمہ نکاح کے بعد شام تک اس کے پاس اسے تسلیاں دیتی رہیں۔ وہ خانی ذہن کے ساتھ ان کے چہرے دیکھتی رہی۔ شام کو وہ دونوں چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ آیا تھا۔

”یہ فلیٹ کی چابیاں ہیں۔ رات کے کھانے کے لیے کچھ بیڑیاں لاکر میں نے پکن میں رکھ دی ہیں۔ فلیٹ میں تقریباً ہر چیز موجود ہے۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو لسٹ بنا دینا۔ میں تمہیں کل لا دوں گا۔ میں اب جا رہا ہوں تم دروازہ لاک کر لو۔ میں صبح آؤں گا۔“

بس ایک داغِ ندامت

وہ اسے یہ ہدایت دے کر اس کا جواب سنے بغیر فلیٹ سے چلا گیا۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ لاک کر لیا تھا۔ واپس بیڈ روم میں آ کر اس نے پہلے کی طرح گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ پچھلے چند ماہ ایک بار پھر اس کے دماغ کی اسکرین پر ابھرنے لگے تھے ایک ایک بات ایک ایک چہرہ۔ ایک ایک منظر جیسے اس کے ذہن پر نقش تھا۔ ”تمہیں زندگی میں کچھ نہیں ملنا چاہیے اسفند حسن! کچھ بھی نہیں۔ میری طرح خالی ہاتھ ہو جانا چاہیے تمہیں بھی۔ میری طرح ذلت اور رسوائی ملنی چاہیے تمہیں۔ میری طرح تمہارے سارے خوابوں کو دھواں بن جانا چاہیے۔ مجھے اپنی زندگی میں نہیں لائے تم عذاب کو لائے ہو۔ میں تمہیں بتاؤں گی سب سے اوپر والی میزگی سے منہ کے بل گرنا کیسا لگتا ہے۔“

اسفند کے خلاف اس کے دل اور دماغ کا زہر بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ساری رات کسی آگ کی طرح بھڑکتی رہی۔ وہ دوسرے دن صبح دس بجے آیا۔ اپنی چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کر وہ کھانے کے کچھ ڈبے لیے اندر آیا۔ وہ اسی کے انتظار میں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ نظریں چراتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

”تم نے اپنے پاس اس فلیٹ کی دوسری چابی کیوں رکھی ہے؟“ اس کے کچن سے باہر آتے ہی مول نے تیز آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ ٹھنک گیا۔ حیرت سے اس نے مول کا چہرہ دیکھا۔

”صرف اپنی سہولت کے لیے؟“

”لیکن میں نہیں چاہتی تمہارے پاس اس فلیٹ کی کوئی دوسری چابی ہو۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی ہوں۔“ مول کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

اسفند نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائی۔ کچھ دیر تک وہ کچھ بولنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

”دیکھو مول! میں.....“ مول نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اپنی گندی زبان سے میرا نام مت لو۔“ اسفند کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا۔

”اگر میری زبان تمہیں گندی لگتی ہے اور میں تمہیں اس قدر ناپسند تھا تو پھر تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”میں تمہیں ناپسند نہیں کرتی ہوں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ ورنہ میں وہ سب کچھ نہیں بھولی ہوں جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔“ وہ عجیب سے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اس کے چہرے سے نظر ہٹائی۔

”میں جانتا ہوں۔ تم نے وہ سب کچھ نہیں بھلایا ہوگا۔ وہ سب کچھ بھلانا اتنا آسان ہے بھی نہیں لیکن میں تم سے ایکسکیوز کرنا.....“

”مجھے تمہارے ایکسکیوز کی ضرورت نہیں ہے اور مجھ سے آئندہ بھی کبھی ایکسکیوز مت کرنا۔“ مول نے تیز

بس ایک داغِ ندامت

آواز میں اس کی بات کا ڈی۔

”میں مانتا ہوں۔ میں نے ایسی غلطی.....“ اس نے دوبارہ اس کی بات کا ڈی۔

”وہ کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ تمہارا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔“

”نہیں۔ میں نے یہ سب صرف وقتی اشتعال میں آکر کیا تھا اگر یہ سب غصے کی حالت میں نہ ہوا ہوتا تو تم تین دن وہاں رہی تھیں۔ میں دوبارہ بھی تمہارے پاس آتا لیکن میں نہیں آیا اگر میرا غصہ اس رات سے پہلے ختم ہو جاتا تو میں تمہیں اسی طرح واپس چھوڑ آتا۔ میں ایسا آدی نہیں ہوں جو کسی عورت کی عزت نہ کرے لیکن میں نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میں اس رات کے بعد سے ٹھیک سے سونیں پایا، تم مجھے جتنا برا سمجھ رہی ہو۔ میرا ضمیر مجھے اس سے زیادہ برا سمجھ رہا ہے۔ پھر بھی میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔“

مول کا دل چاہتا تھا اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل ہو اور وہ اس کے چہرے کو اس سے مسخ کر دے۔ اب شکست خوردگی تھی۔ اس کے لہجے میں تب کیا تھا۔ اب ندامت تھی اور تب۔ تب فخر تھا۔ غرور تھا، اب سر جھکا ہوا تھا اور تب.....

”تم اب ساری زندگی بھی میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہو تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں معاف کیا جائے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بیٹی ہو اور اس کے ساتھ بھی یہی سب کچھ.....“

اسفند نے بہت تیز آواز میں اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”تم ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا مت کہو۔“

”کیوں نہ کہوں۔ میں کہوں گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار کہوں گی۔ کیا کر لو گے تم؟ بتاؤ کیا کرو گے تم؟ بولو کیا کرو گے؟“

وہ یک دم چلانے لگی تھی۔ اسفند نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر سامنے پڑی ٹیبل پر فلیٹ کی چابی چھینکتے ہوئے تیزی سے فلیٹ سے چلا گیا۔

☆

اس دن کے بعد دوبارہ دونوں میں بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر روز چند منٹوں کے لیے وہاں آتا اور ضرورت کی چیزیں چھوڑ کر چلا جاتا مول سارا دن اس فلیٹ میں بند رہتی۔ فاطمہ اور ربیعہ روزانہ ایک ڈینڈھ گھنٹہ کے لیے اس کے پاس آتی تھیں اور وہ وقت بجلی کی چمک کی طرح گزرتا پھر باقی سارا وقت وہ پنجرے میں بند جانور کی طرح بیڈ روم بالکلونی، لائونج اور کچن کے چکروں میں گزارتی۔ اسے اپنا گھر اور لوگ بے تماشاً یاد آتے۔ اسے یاد آتا۔ اس کے بھائی کس طرح اس کے بازو اٹھایا کرتے تھے کس طرح اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو پورا کرتے تھے۔ اور ہر یاد جیسے اس کا گلا دبانے لگتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اسے اپنے بھتیجے، بھتیجیوں کے قہقہے یاد آتے اسے ان کی شرارتیں اور شوخیوں یاد آتیں اور وہ کئی کئی گھنٹے سر ہاتھوں میں پکڑے اپنے گال بھگوتی رہتی۔

”اور اس سب کا ذمہ دار یہی ایک شخص ہے۔ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔“

وہ سوچتی اور اسفند کے لیے اس کے دل میں زہر بڑھتا جا رہا تھا۔

اسفند بہت دنوں تک اپنے ماں باپ سے یہ خبر نہیں چھپا سکا تھا کسی نہ کسی طرح یہ خبر اس کی فیملی تک پہنچ ہی گئی تھی۔ پہلے پہل تو اس کے والدین نے اس خبر پر دھیان نہیں دیا اور اسے صرف ایک افواہ سمجھی کیونکہ اسفند کی منگنی چند سال پہلے ہی اس کی اپنی پسند سے اس کی چچا زاد سے ہوئی تھی۔ دونوں شروع سے ہی اکٹھے پڑھتے رہے تھے اور یہ باہمی انڈراسٹینڈنگ بعد میں محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ گر بچپن کے بعد اسفند نے نوشین کے بارے میں اپنے والدین کو آگاہ کر دیا تھا اور انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ایک دم ان عجیب قسم کی خبروں نے حسن علی کو کافی پریشان کر دیا تھا۔ انہوں نے ڈائریکٹ اسفند سے بات کرنی مناسب سمجھی۔ وہ دو بہنوں اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور ماں اور باپ دونوں کے کافی قریب تھا یہی وجہ تھی کہ حسن علی نے اس معاملے پر اس سے بات کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا تھا۔ اور اس وقت انہیں شاید زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا لگا تھا جب اسفند نے ان کے استفسار پر انکار یا تردید کرنے کے بجائے اپنی شادی کا اعتراف کر لیا تھا۔ حسن علی کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر جب انہیں یقین آیا تو وہ جیسے آگ گولہ ہو گئے تھے۔

”اگر تمہیں اس طرح کا کارنامہ کرنا تھا تو تمہیں نوشین سے منگنی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”آپ نوشین سے میری منگنی ختم کر دیں۔ اس شادی کے بعد اب کسی اور رشتہ کی گنجائش نہیں رہی۔“

”تم کون ہوتے ہو یہ کہنے والے تم منگنی کہیں اور کرو شادی کہیں اور۔ لیکن اگر تم اس فیملی میں رہنا چاہتے ہو تو کل شام تک اچھی طرح سوچ لو اور اس لڑکی کو طلاق دے دو۔“

حسن علی نے چند لمحوں میں اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اٹھ کر چلے گئے تھے۔

دوسرے دن شام کو انہوں نے پھر اسفند کو بلوایا۔ ”پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“ انہوں نے اس کے پیچھے ہی

پوچھا۔

”پاپا! آپ جانتے ہیں۔ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں سر جھکائے ہوئے کہہ دیا۔

حسن علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ سامنے ٹھیل پر طلاق کے کاغذات پڑے ہیں اور ایک بلیٹک چیک

ہے۔ پھر زپر سائن کر دو اور چیک میں جتنی رقم چاہے بھرو اور اس لڑکی کو بھیج دو اور دوسرا راستہ ہے یہ کہ تم اس گھر سے چلے جاؤ۔“

اسفند ستے ہوئے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”پاپا! میں دوسرا راستہ اختیار کروں گا۔“ وہ کمرے سے جانے لگا۔

”اسٹی! الحق مت بنو۔ ایک دفعہ پھر سوچو۔“ اس کی مٹی نے اسے جاتے ہوئے روکا۔

مٹی! میں اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔ وہ جھٹکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تم فیصلہ نہیں بدلو گے تو مت بدلو لیکن پھر اس گھر سے کچھ بھی لے کر مت جانا۔ اسی طرح جاؤ اور جس فلیٹ میں تم نے اس لڑکی کو رکھا ہوا ہے۔ وہ میں آج تمہارے دوست کے باپ سے خرید چکا ہوں۔ کل تک اسے خالی کر دو۔ اپنی عیاشیوں کے لیے خود رو پیہماؤ میری کمائی تم ان لڑکیوں پر نہیں اڑا سکتے۔“

وہ چند لمحے زرد چہرے کے ساتھ باپ کو دیکھتا رہا پھر ہونٹ کاٹنے ہوئے دروازے کے طرف بڑھ گیا۔

”میری آفر ابھی بھی وہیں ہے۔ تم جب چاہو اس لڑکی کو طلاق دے کر واپس آ سکتے ہو تمہیں ہر چیز مل جائے گی۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بالکل خالی الزبتھی کے عالم میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کرے۔ کس کی مدد مانگے۔ اسے اپنے ماں باپ پر غصہ آیا تھا۔ یہ سب اس کے لیے خلاف توقع نہیں تھا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی شادی کی خبر اس کے باپ تک اتنی جلدی پہنچ جائے گی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے اپنے سارے ڈاکومنٹس نکالے اور پھر اپنے گھر سے نکل آیا۔ اس نے ایک بی بی او سے راشد کو فون کیا۔

”سوری اسفند! میں نہیں جانتا۔ ڈیڈی کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں نے فلیٹ تمہیں دے رکھا ہے اور وہاں تمہاری بیوی رہتی ہے میرا خیال ہے یہ ساری انفارمیشن حسن انکل نے ڈیڈی کو دی ہے۔ اب ڈیڈی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ایک دن کے اندر اندر تم سے یہ فلیٹ خالی کروا لوں۔ میں نے ایک آدمی سے بات کی ہے۔ اس کے کچھ فلٹس ہیں جنہیں وہ کرائے پر دیتا ہے۔ وہ گلٹری فلیٹ تو نہیں ہیں لیکن بہر حال اتنے برے بھی نہیں ہیں۔ تم دونوں کے لیے کافی ہے۔ میں نے اسے تین ماہ کا کرایہ دے دیا ہے لیکن تم کسی دوسرے دوست کو اس فلیٹ کا اتنا پتا نہ دینا اگر پھر کہیں حسن انکل تک بات پہنچ گئی تو وہ یہ فلیٹ بھی خالی کروانے کی کوشش کریں گے اور تمہارے لیے بہت سے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ میں کل صبح تمہارے فلیٹ پر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔“

اسفند نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

☆

اس شام جب وہ فلیٹ پر آیا تو کافی پریشان تھا۔ مول اس وقت کھانا کھا رہی تھی۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر پھرتا رہا جب اس نے کھانا ختم کر لیا تو وہ اس کے پاس آیا۔

”تم اپنی چیزیں پیک کر لو ہم صبح یہ فلیٹ چھوڑ دیں گے۔“

مول نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا مگر کچھ پوچھا نہیں۔

”کل ہم ایک دوسرے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ میں تم پر کچھ باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے والدین کو میری شادی کا پتا چل گیا ہے اور میں نے گھر چھوڑ دیا ہے یا یہ سمجھ لو کہ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ میرے پاس اب صرف چند ہزار روپے ہیں اور وہ بہت عرصہ نہیں چلیں گے جب تک میرے پاس روپیہ تھا۔ میں نے تمہیں ہر آسائش دینے کی کوشش کی۔ اب میرے پاس روپیہ نہیں ہے اس لیے میں تمہیں پہلے کی طرح سہولیات

بس ایک داغِ ندامت

فراہم نہیں کر سکوں گی۔ لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہ ہو بہر حال تمہیں کچھ بڑا وقت گزارنا پڑے گا۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ کسی ردعمل کے بغیر ڈانٹنگ ٹیبل سے برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ وہ بے دلی سے وہ سامان پیک کرنے لگا جو وہ وقتاً فوقتاً خرید کر لاتا رہا تھا۔

اگلی صبح وہ راشد کے ساتھ نیا فلیٹ دیکھنے گیا۔ دو کمروں، کچن، باتھ روم اور لہریں پر مشتمل وہ فلیٹ اس کے لیے کافی تھا۔ یہ فلیٹ پہلے فلیٹ کی طرح فرزند نہیں تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ دو پہر تک وہ اپنا تھوڑا بہت سامان نئے فلیٹ میں منتقل کر چکا تھا۔ اپنے والٹ میں موجود رقم سے اس نے ضرورت کی کچھ اور بنیادی چیزیں خریدیں پھر وہ راشد کی گاڑی میں مول کوئی جگہ لے آیا تھا۔ وہ خود ہی اس تھوڑے بہت سامان کو فلیٹ میں سیٹ کرنا رہا۔ مول کسی تماشائی کی طرح اس کی سرگرمیاں دیکھتی رہی۔ اسفند کے چہرے کی سنجیدگی اور پریشانی اسے ایک عجیب سا سکون پہنچا رہی تھی۔

”اسفند حسن! اب..... اب تمہیں احساس ہو گا کہ اپنوں سے کٹ کر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کل تک جو آپ کے لیے جان دینے پر تیار تھے وہ آج آپ کو دیکھنا تک نہیں چاہتے۔“

راست کو وہ بیڈ روم میں سونے کے لیے چلی گئی اور وہ خالی ڈرائنگ روم میں اپنے خریدے ہوئے میٹرز کو بچھا کر اس پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ آنکھیں کھولے وہ اندھیرے میں کمرے کی چھت دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

”تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ اس طرح مجھے بے وقوف کیوں بنایا۔ میں ہمیشہ ہر معاملے میں تمہارے ساتھ ٹیئر رہی ہوں پھر تم نے اسفند! تم نے میرے ساتھ اس طرح کیوں کیا؟“ اس کے کانوں میں کسی کی سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔

دو دن پہلے نوشین نے اسے فون کیا تھا۔ شاید می نے اسے فون کر کے اس کا اعتراف کے بارے میں بتایا تھا۔
”تم ایسے نہیں تھے اسفند! تم تو کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔“ وہ پلکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”ہاں پہلے نہیں تھا اب ہو گیا ہوں۔ نوشین! تم مجھے معاف کر دو اور آسندہ..... آسندہ کبھی میرے ساتھ کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تمہارے قابل نہیں رہا ہوں۔ تمہیں مجھ سے بہت بہتر، بہت اچھے انسان مل سکتے ہیں۔ میرے جیسا تھر ڈریٹ اور تھر ڈکلاس شخص تمہارے لائق نہیں تھا۔“ اس نے اسے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

پھر بہت دیر تک فون کی بیل بجتی رہی لیکن اس نے ریسپونڈ نہیں اٹھایا۔ پھر وہ اس کے گھر آئی تھی لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ وہ بہت دیر تک اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتی رہی اور وہ کسی پتھر کے جسے کی طرح راکگ پتھر پر جھولتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسے اپنا چہرہ دکھاتا۔ اس کے سامنے آتا۔ اس سے

بس ایک داغِ ندامت

بات کرتا۔ وہ مایوس ہو کر روتی ہوئی چلی گئی تھی۔ وہ ساری رات اپنے اور نوٹسین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آتا رہا۔ اس کی باتیں بار بار اس کے ذہن میں گونجتی رہیں۔

”ہر شخص کو اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ میری غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ مجھے تم نہ ملو۔ میں ساری زندگی اس چیز کے بغیر رہوں جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔“

اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے سوچا۔

☆

انگلے چند دنوں میں اس نے ایک ٹائٹ کالج میں جاب ڈھونڈ لی۔ چند ہفتے اس نے وہاں کام کیا اور پھر اس کے پیرز شروع ہو گئے۔ وہ تین ہفتے پیرز میں مصروف رہا۔ پیرز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مختلف جگہوں پر جاب ڈھونڈنی شروع کر دیں۔ اپنے دوستوں کے ذریعے سے وہ جہاں بھی جاب ڈھونڈتا، وہاں سے بہت جلد حسن علی اسے فارغ کروا دیتے۔ اس نے تنگ آ کر دوستوں کی مدد لینا چھوڑ دیا۔ ایک پارٹ ٹائم جاب اسے راشد نے دلوائی ہوئی تھی۔ ایک اکیڈمی کے ذریعے اس نے کچھ ٹیوشنر حاصل کر لیں اور رات کو وہ اسی ٹائٹ کالج میں پڑھاتا تھا لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ یہ سب کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔

اسے ہر ماہ تقریباً آٹھ دس ہزار مل جاتے تھے۔ لیکن فلیٹ کا کرایہ مل اور دوسرے اخراجات نکال کر اس کے پاس صرف ایک دو ہزار بچتا تھا اور یہ رقم کافی نہیں تھی۔ پہلی بار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ روپیہ کماتا کتنا مشکل کام ہے۔ اس نے بچپن اور جوانی دونوں آسائشوں میں گزاری تھی۔ چھٹی رقم اب اسے کمانے کے لیے رات دس بجے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس سے دو گنی رقم حسن علی اسے ہر ماہ جیب خرچ کے طور پر دیتے تھے پھر بھی اس کے اخراجات پورے نہ ہوتے اور وہ وقتاً فوقتاً ان سے مزید رقم لیتا رہتا تھا۔

حسن علی ایک نامور صنعت کار تھے اور چیئر آف کامرس کا صدر ہونے کی وجہ سے ان کی بے تحاشا مصروفیات تھیں لیکن اپنے بزنس میں بے حد مصروف رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ بہت توجہ دی تھی اور یہی حال عزیزین حسن کا تھا۔ جو شادی سے پہلے ایک کالج میں لیکچرر تھیں لیکن شادی کے بعد انہوں نے اپنی جاب چھوڑ کر پوری توجہ بچوں پر دی تھی۔ انہوں نے کبھی بچوں پر بے جا پابندیاں نہیں لگائیں اور نہ ہی ان پر کیریئر کے انتخاب کے سلسلے میں دباؤ ڈالا۔

اسفند کے سب سے بڑے بھائی نے اپنی مرضی سے باپ کے ساتھ بزنس سنبھالنا شروع کر دیا تھا لیکن اسفند کا دوسرا بھائی میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سول سروس میں چلا گیا تھا اور یہی کام اسفند نے کیا تھا۔ اکناکس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے بھی باپ کے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹانے کی بجائے سول سروس میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی بڑی بہنوں میں سے بھی دو ڈاکٹر تھیں اور ایک کسی بینک میں کام کرتی تھی۔

اسفند اور اس کی ایک بہن کے علاوہ باقی سب شادی شدہ تھے اور اب جیسے اسفند کا ایک قدم اسے زندگی

بس اک داغِ ندامت

کے سب سے بڑے بھران میں لے آیا تھا۔ وہ اپنی پوری فیملی کا چہنچہا تھا لیکن اس بیارحمت نے اسے بگاڑا نہیں تھا۔ اس کی زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی اور پھر یک دم جیسے اسپید بریکر آ گیا تھا۔ اس کا تھوڑا سا غصہ اسے آسمان سے زمین پر لے آیا تھا اور اب اب وہ کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

مول نے خود بھی کبھی ان حالات میں رہنے کا تصور نہیں کیا تھا اس کی فیملی مانی لحاظ سے اسفند حسن کے مقابل نہیں آ سکتی تھی لیکن وہ کوئی عام سے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس کے دونوں بھائی انجینئر تھے اور اس کا بڑا بھائی ایل ڈی اے میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ زندگی کی ہر سہولت اسے دستیاب تھی اور اب وہ جس فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ اس میں برائے نام فرنیچر تھا۔ آسائش تو بہت دور کی بات تھی۔

دونوں کے تعلقات میں وقت گزرنے کے ساتھ بھی کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ مول اسفند کا کوئی کام نہیں کرتی تھی جو واحد معنایت وہ کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ کھانا تھوڑا زیادہ پکا لیا کرتی تھی اور اسفند کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔ وہ صبح گھر سے نکلنا اور پھر رات گئے واپس آتا۔

مول سارا دن گھر میں بند رہتی۔ اس نے اس پاس کے فلیٹ والوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ان کے گھر آئے۔ ان کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرے۔ جوں جوں ڈیوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ اسفند سے اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یہ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے بچے کو کیسے دیکھے گی۔ کیسے چھوئے گی۔ کیسے قبول کرے گی۔ بعض دفعہ اسے یہ سوچ کر گھن آنے لگتی کہ اس نے اس شخص سے شادی کرنا کیسے قبول کیا ہے جس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ فاطمہ اور ربیعہ اب بھی اس کے پاس آتی تھیں مگر اب ان کی آمدورفت میں کچھ وقفہ آ گیا تھا۔ وہ دونوں ہر بار اسے ماضی بھول جانے کی تلقین کرتیں اور وہ آگ بگولا ہو جاتی۔

اس دن وہ آفس میں تھا جب ربیعہ نے اسے فون کر کے ہاسپٹل بلوایا تھا۔ اور جب ہاسپٹل پہنچا تو اسے بیٹی کی پیدائش کی اطلاع ملی تھی وہ بڑے عجیب سے احساسات سے دوچار ہوا تھا۔

”مول کیسی ہے؟“ اس نے فاطمہ سے پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہے۔“ اسے فاطمہ کا لہجہ کچھ بھجا بھجا سا لگا پھر وہ مل ادا کرنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور ڈاکٹر نے اسے بٹھا لیا۔

”میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آپ کی طرف سے آپ کی مزر پر کیا بیٹے کے لیے کوئی دباؤ تھا؟“

اسفند نے حیرانی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ”بالکل بھی نہیں۔ آپ کو یہ کس نے کہا ہے؟“

”تو پھر آپ کی مزر اس قدر رو کیوں رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو دیکھنے اور اسے فیڈ کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ ہم نے انہیں سکون آور انجکشن لگا کر ملایا ہے ورنہ ان کی حالت اس طرح رونے سے زیادہ خراب ہو جاتی۔“

وہ لیڈی ڈاکٹر کی بات پر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”اگر آپ کی طرف سے ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا تو پھر انہیں کیا ہوا ہے؟“ ڈاکٹر الجھ گئی تھی۔
 ”ہوسکتا ہے۔ انہیں خود ہی بیٹے کی خواہش ہو اور اس وجہ سے بیٹی کی پیدائش پر انہیں صدمہ پہنچا ہو بہر حال میری طرف سے ان پر کوئی پریشر نہیں تھا۔“
 اس نے بہانا بنا کر ڈاکٹر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر پتا نہیں مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ سستے ہوئے چہرے کے ساتھ ڈاکٹر کے آفس سے نکل آیا۔
 ”اسفند! تم اپنی بیٹی کو نہیں دیکھو گے؟“ ربیعہ نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔
 اس نے ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔ انکو بیٹر میں اس نے پہلی بار اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا اور پھر نرس نے اس کی بیٹی کو اس کے ہاتھوں میں تمنا دیا۔
 ”آپ کی بیٹی بہت خوبصورت ہے۔ آپ کو دیکھ کر سوچ رہی ہوں۔ اسے تو خوبصورت ہونا ہی تھا۔“ اس نے نرس کو کہتے سنا۔ وہ بہت غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے کپکپاتے ہونٹوں کو سختی سے بچھنچھنچ لیا۔ بہت نرمی سے اس کا ہاتھ چوم کر اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ کسمسانے لگی۔

نرس نے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی کو لے لیا۔ پھر ربیعہ اور فاطمہ کے ساتھ وہ مول کے پاس بھی گیا۔ وہ نیند آور ادویات کے زیر اثر سو رہی تھی۔ ورنہ اسے سامنے دیکھ کر وہ پھٹ پڑتی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر واپس آ گیا تھا۔
 مول بہت زیادہ دن بچی سے نفرت نہیں کر پائی۔ تیسرے دن اس نے روتے ہوئے اسے گود میں لے لیا تھا۔ اس کے دل میں اسفند کے لیے نفرت تھی لیکن اپنی بیٹی کے لیے نفرت نہیں رہ پائی۔ ربیعہ اور فاطمہ کی طرح اسفند نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ چند دن ہسپتال میں رہ کر وہ گھر آ گئی تھی اور اسفند کے لیے اس کے تئیر پہلے سے بھی زیادہ بگڑے ہوئے تھے۔ وہ بات بے بات اس سے الجھ پڑتی اور بعض دفعہ جب وہ ناشی کو اٹھانے لگتا تو وہ اسے ہاتھ لگانے نہ دیتی۔ اس کا رویہ اسفند کی سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا کہ وہ خودکشی کر لے۔ وہ صرف اسے آرام و آسائش دینے کیلئے رات گئے تک کسی جانور کی طرح کام کرتا رہتا تھا اور وہ پھر بھی اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ پھر بھی خوش نہیں تھی۔

انہیں دنوں اس کا سی ایس ایس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور وہ ساتویں پوزیشن لے کر کامیاب ہوا تھا۔ ایک سال میں یہ پہلی خوش خبری تھی جو اسے ملی تھی چھپلے سال میں کی گئی ساری محنت ساری ذلت اسے بھول گئی تھی۔ وہ بے حد ہر سکون اور مطمئن تھا اور اس اطمینان اور سکون نے مول کے وجود میں ایک آگ بھڑکا دی تھی۔ ربیعہ اور فاطمہ نے گھر آ کر اسے مبارکباد دی تھی اور وہ پیش میں آ گئی تھی۔

”مجھے اس کی کامیابی کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ کام ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی۔“

”مول! فضول! تیں مت کرو۔ کیا تم خوش نہیں ہو کہ اب تم بھی ایک اچھی زندگی گزار سکو گی، معاشرے میں

بس اک داغِ ندامت

تم لوگوں کا کوئی مقام ہوگا تمہاری بیٹی کو ساری آسائش ملیں گی۔“ ربیعہ نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔

”بھائی میں جائیں یہ آسائشیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوش حال زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے ان

سب آسائشوں سے نفرت ہے جو مجھے اس کے طفیل ملیں گی۔“

”مومل! تم سب کچھ بھول کیوں نہیں جانتیں؟“ فاطمہ نے اس سے کہا تھا۔

”اگر یہ سب تمہارے ساتھ ہوتا تو کیا تم بھول جانتیں؟“

”بھولنے کی کوشش ضرور کرتی۔“ فاطمہ نے نظریں چراتے ہوئے دہمی آواز میں کہا۔

”لیکن میں کبھی بھولنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی۔ میں سب کچھ یاد رکھوں گی اور اسے بھی یاد دلاتی رہوں

گی۔“

”تم اپنی زندگی جہنم بنا لو گی۔“

”کیا اب یہ زندگی جہنم نہیں ہے۔“ ربیعہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ سننے کچھ سمجھنے پر تیار ہی نہیں تھی۔

☆

”حسن اکل تم سے بات کرنا چاہتے ہیں؟“ اس دن راشد نے اسفند کو آفس فون کر کے بتایا تھا۔

”کیوں؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ بس انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے رابطہ کر کے ان کا پیغام تم تک پہنچا دوں۔“

”ٹھیک ہے میں کل شام گوگر جاؤں گا۔“ اس نے راشد کو مطلع کیا تھا۔

دوسرے دن وہ شام کو چھ ماہ کے بعد گھر گیا تھا۔ سب اس سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے سوائے حسن علی کے۔

”تو تم نے سی ایس ایس کو ایفائی کر لیا ہے؟“ اسے دیکھتے ہی انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے بے تاثر لہجے

میں کہا۔

”اور اب تمہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ تم میرے محتاج نہیں رہے اور میرے بغیر بھی آرام سے زندگی گزار سکتے

ہو۔“ ان کا لہجہ بہت سرد تھا۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

”تم نے اپنے ٹیبلے میں کوئی تھریٹی کی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ٹھیک ہے پھر تم جاؤ۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”پاپا! میری ایک بیٹی ہے۔ کیا میں خود کو ٹھوکروں سے بچانے کے لیے اسے دھکے کھانے کے لیے چھوڑ

دوں۔“

”ہاں۔ اسے بھی چھوڑ دو۔ ایسے رشتوں کی ہمارے خاندان میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی نہ ہی ایسی اولادیں

تبول کی جاتی ہیں۔ تم اس کی ماں کو کچھ روپیہ دے دینا، وہ خود ہی اسے پال لے گی۔“ انہوں نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔

”نہیں۔ میں اپنی بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بات اگر صرف ضد کی ہے تو ٹھیک ہے پھر آپ کو جو کرنا ہے کر لیں لیکن میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔“
وہ تلخ لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆

پھر وہ ٹریٹنگ کے لیے اکیڑمی چلا گیا تھا۔ ہر ہفتہ ویک اینڈ پر وہ آتا اور زاشی کو اٹھائے رکھتا۔ مول زاشی کے لیے اس کے اس انکعات پر جیسے مجلس جاتی تھی۔ اسفند کی موجودگی میں زاشی اگر رونے لگتی تو وہ اسے بُری طرح بیٹھتی۔ اسفند اسے روکنے کے بجائے خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہتا اور جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکی ہوتی تو وہ روتی ہوئی زاشی کو اٹھاتا اور باہر لے جاتا۔ اور جب وہ کچھ دیر بعد اسے واپس لے کر آتا تو زاشی اپنے ہاتھوں میں کھانے پینے کی کوئی چیز چکڑے اس کی گود میں کھلکھلا رہی ہوتی۔ اور اس کی یہ ہنسی مول کو زہر لگتی۔

زاشی سے اس کا یہ سلوک اسفند کو دلبرداشتہ کر دیتا تھا۔ وہ جب بھی اسے مارتی تھی۔ ساتھ بلند آواز میں بولتی اور طعنے دیتی۔ اسفند جانتا تھا۔ وہ یہ سب اسے سناتی ہے ورنہ ڈیڑھ سال کی وہ بیٹی کیا سمجھ سکتی ہے۔ اس کی ہزار معذرتیں بھی مول کے دل کو صاف نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اکیڑمی واپس جانے کے بعد یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا کہ جب مول اس کے سامنے زاشی کو بھٹنے پر تیار نہیں ہوتی تھی تو اس کے پیچھے تو پتا نہیں وہ اس کا کیا حشر کر دیتی ہوگی۔ یہی وہ تھی کہ وہ جب ویک اینڈ پر واپس گھر آتا تو سارا وقت زاشی کو لپٹائے رکھتا۔ اسے سیر کے لیے باہر لے کر جاتا۔ اس کے لیے کھلونے لاتا۔ اس کے ساتھ کھیلتا۔ وہ جیسے ایک دن میں پورے ہفتے کی تلافی کر دینا چاہتا تھا۔

زاشی بھی مول کے بجائے اسفند سے زیادہ مانوس ہو گئی تھی اسے باپ کا لیس زیادہ پسند تھا۔ وہ جب ویک اینڈ پر گھر آتا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگتی یوں جیسے اس نے اسفند کو پہچان لیا ہو۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا پہلا لفظ بھی باپ ہی تھا۔ اسفند کی غیر موجودگی میں زاشی کے ساتھ مول کا سلوک بہت اچھا ہوتا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھائے رکھتی اور بعض دفعہ بے اختیار ہو کر اسے چوم لیتی۔ وہ تھی ہی اتنی خوبصورت کہ اس پر بے اختیار پیارا آتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے سارے نقوش لیے تھے۔ وہی تنگی ناک، ڈارک براؤن آنکھیں، لمبی خم دار پلکیں، باریک ہونٹ اور سیاہ گتے چمکدار بال جس میں اسفند کی طرح بعض جگہوں پر براؤن بالوں کے گچھے بھی تھے۔ وہ اسفند سے اس قدر مشابہہ تھی کہ اس کی گردن پر بھی اسی جگہ مل تھا جس جگہ اسفند کا مل تھا۔ بعض دفعہ اس کی یہ مشابہت مول کو بہت تکلیف پہنچاتی تھی۔

☆

اسفند اب اپنے ماں باپ سے بھی ملنے جانے لگا تھا۔ مول کو طلاق دینے کے لیے ابھی بھی اس پر دباؤ موجود تھا اور اس دباؤ کی بنیادی وجہ نوشین تھی جو کہیں اور شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنی بات پر قائم تھا وہ مول اور زاشی کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ لیکن بہر حال حسن نے اپنی جائیداد سے دوسرے بچوں کی طرح اُس کا حصہ بھی اُسے دے دیا تھا پھر ان ہی دنوں خاندان میں ہونے والی ایک تقریب میں اس کی ملاقات نوشین سے ہوئی۔ اور یہ ملاقات دونوں کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ اگر وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہا ہوتا تو شاید وہ اتنی جلدی نوشین کی طرف مائل نہ ہوتا لیکن جس طرح کی زندگی وہ مول کے ساتھ گزار رہا تھا اور جس طرح وہ اس کے ہاتھوں تڑیل کا نشانہ بنتا تھا۔ اس نے اسفند کو ایک بار پھر نوشین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی سوجھ میں واضح تبدیلی آ چکی تھی۔

وہ ویک اینڈ پر گھر گیا اور مول کو بغور دیکھتا رہا۔ پہلی بار وہ اسے نوشین سے کہیں گرا رہا تھا اور ہر چیز میں نوشین کا پلہ بھاری تھا۔ وہ مول سے زیادہ خوبصورت، زیادہ دولت مند، زیادہ تعلیم یافتہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اسفند سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ مول کا رویہ اب بھی اس کے ساتھ ویسا ہی تھا وہ اب بھی اس کا کوئی کام نہیں کرتی تھی نہ اسے مخاطب کرتی تھی۔ وہ پہلی بار اضطراب کا شکار ہوا تھا۔

”مول کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے۔ جتنی محبت اور توجہ وہ زاشی کو دیتی ہے۔ اتنی تو نوشین بھی دے سکتی ہے۔ اس زبردستی کے رشتے کو قائم رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ مجھے اسے آزاد کر دینا چاہیے۔ میں اسے اتنا روپیہ دے دوں گا کہ اسے کوئی مالی پریشانی نہیں ہوگی وہ آرام سے زندگی گزار سکتی ہے۔ اور میں..... میں نوشین کے ساتھ نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتا ہوں۔“

وہ جتنا سوچوں کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ اسے اتنا ہی پریشان کرتیں۔ وہ اب جب بھی گھر آتا۔ ہر وقت مول اور نوشین کا موازنہ کرتا رہتا اور پھر اس کا رویہ تبدیل ہوتا گیا تھا۔

مول یہ جان چکی تھی کہ وہ دوبارہ اپنے والدین سے ملنے لگا ہے کیونکہ اب ایک بار پھر اس کے پاس ایک بہت مہنگی سی گاڑی تھی اور اس نے فلیٹ کو بھی فرشتہ کروایا تھا لیکن اس کے ذہن میں یہ بات کہیں نہیں تھی کہ وہ اب اسے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ انہیں دنوں ہاؤس جاب حاصل کرنے کے بعد فاطمہ واپس اپنے والدین کے پاس چلی گئی تھی کیونکہ اس کی شادی طے ہو گئی تھی۔

فاطمہ کے جانے کے بعد ربیعہ کی آمد بھی کم ہو گئی تھی کیونکہ وہ اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس دفعہ وہ کافی دنوں بعد مول کے پاس آئی تھی۔ اسفند بھی گھر آیا ہوا تھا۔ ربیعہ سے کچھ دیر تک بات چیت کرنے کے بعد وہ باہر چلا گیا تھا اور ربیعہ ایک دم فکر مند نظر آنے لگی۔

”مول! یہ اسفند کچھ بدلا ہوا لگا رہا ہے؟“ اس نے مول سے پوچھا۔

”کیا بدلا ہے اس میں؟“ مول نے لا پرواہی سے جواب دیا۔ ربیعہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔

”مومی! یہ تمہیں پتا ہونا چاہیے۔ تمہیں اس کی بیوی ہو کر یہ نہیں پتا کہ اس میں کیا تبدیلی آئی ہے اور میں یہاں پندرہ منٹ اس کے ساتھ بیٹھی ہوں تو مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔“

”تو میں کیا کروں؟“ مومل نے ناگواری سے کہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”مومی! میں نے دو تین بار اسے کسی لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتی وہ لڑکی کون ہے لیکن اسفند کا جو رویہ اس کے ساتھ نظر آتا ہے، وہ کوئی اطمینان بخش بات نہیں ہے۔ تم اس کی بیوی ہو تمہیں اس پر چیک رکھنا چاہیے۔“

”مجھے اس پر چیک رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی ہے کہ وہ کس کے ساتھ اور کیوں پھرتا ہے۔ میری طرف سے وہ جنم میں جائے۔“

رہیہ اس کی بات سن کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے میرا کام تمہیں متنبہ کرنا تھا، میں نے کر دیا اگر تم جانتے ہو جیسے نقصان اٹھانا چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

وہ خفگی کے عالم میں وہاں سے چلی آئی تھی۔ مومل پر اس کی باتوں یا خفگی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اب بھی اسفند کے رویے کو جانچنا شروع نہیں کیا تھا۔

اسفند پہلے ہی کی طرح فلیٹ پر آتا تھا لیکن اب وہ گھر پر اتنا دھیان نہیں دیتا تھا۔ پہلے وہ ہر بار آنے پر اس سے پوچھتا کہ کیا گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہے یا بغیر پوچھے ہی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے پر وہ چیز لے آتا لیکن اب وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ وہ بس ہر ماہ کچھ روپے بیڑی کی دراز میں رکھ دیتا۔ اب وہ گھر پر کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔ ہاں البتہ زاشی کے لیے اس کی محبت اور توجہ میں کمی نہیں آئی تھی۔ پھر انہیں دنوں اسے پہلی پوسٹنگ ملی اور وہ اے ایس پی کے طور پر ملتان چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مومل سے صرف اتنا کہا۔

”اب شاید میں ہر پختے نہ آسکوں اگر کوئی ابھر چنسی ہو تو تم اس نمبر پر راشد کو کال کر لینا۔“

رہیہ کو اس کی پوسٹنگ کی خبر ملی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر اس کے پاس آئی۔

”وہ تمہیں ساتھ لے کر کیوں نہیں گیا؟ اس سے کہو کہ وہ تمہیں ساتھ لے کر جائے۔ اسے کوئی پرالہم نہیں ہے۔ اسے وہاں گھر ملا ہوا ہے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتا۔ تم اس سے بات کرو۔“

وہ اسے سمجھاری تھی۔

”رہیہ! میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتی۔ وہ خود ساتھ لے جائے تو ٹھیک ہے لیکن میں اس کی منتیں نہیں کروں

گی۔“ مومل نے صاف انکار کر دیا۔

”تم بے قوف ہو۔ اس کے لیے راہ ہموار کر رہی ہو۔ کون بیوی اس طرح شوہر کو دور بھیج دیتی ہے۔ ابھی

تک اس کے پیروں میں زاشی کی محبت کی زنجیر تھی۔ اب وہ اس سے دور رہے گا تو یہ رشتہ بھی کمزور ہو جائے گا۔ تم سے تو

خیر وہ پہلے ہی برگشتہ ہو چکا ہے۔ تم اس قدر راضی ہو کہ تم اس کی اس کمزوری کو بھی شتم کر رہی ہو۔“

مول جلیلی با راس کی باتوں پر کچھ ٹکرمند ہوئی۔ ”تو میں کیا کروں؟“

”اب جب وہ آئے تو تم مجھے فون کر دینا۔ میں خود آ کر اس سے بات کروں گی۔“

مول نے ربیعہ کی بات پر سر ہلا دیا۔

وہ ایک ماہ بعد آیا تھا اور مول نے ربیعہ کو بلوا لیا تھا۔ تھوڑی دیر اس سے دوسری باتیں کرنے کے بعد ربیعہ

نے اس سے ان دونوں کو ساتھ لے جانے کی بات کی وہ یک دم چپ ہو گیا۔

”ہاں لے جاؤں گا۔ ابھی تو میں خود ایڈ جسٹ نہیں ہو پایا وہاں۔ پھر ویسے بھی ملتان میں گرمی بہت ہے۔

اور زاشی ایسے موسم میں نہیں رہ سکے گی۔“ اس نے جیسے ہالے کی کوشش کی۔

”زاشی ہر جگہ ایڈ جسٹ ہو جائے گی اگر وہاں تم ہو گے۔ تم جانتے ہو وہ تمہیں بہت مس کرتی ہے۔ تمہاری

موجودگی اس کے لیے بہت اہم ہے۔“

”اچھا میں دیکھوں گا۔“ اس نے یہ کہہ کر بات بدل دی۔

ربیعہ جان گئی کہ وہ اب اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔

دوسری صبح اسفند واپس چلا گیا تھا اور شام کے وقت ربیعہ ایک بار پھر آئی تھی۔

”مومی! میں ایک بات تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں، وہ تمہیں ساتھ لے جانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور

ندہی وہ تمہیں ساتھ لے کر جائے گا۔ اور یہی بات میں تمہیں بہت عرصہ سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب بھی وقت

ہے اپنا رویہ بدلو۔ شاید اس کے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔“

مول جلیلی با راس کی باتوں کے جواب میں خاموش رہی تھی اور اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

☆

اسفند میں آنے والی تبدیلی کا صحیح اندازہ اسے تب ہوا تھا جب وہ دوسری بار آیا تھا۔ زاشی اور وہ دونوں بیڈ

روم میں تھے۔ اس نے زاشی کے کپڑے تبدیل کیے تھے۔ اسفند نہانے کے لیے ہاتھ روم میں گیا ہوا تھا۔ وہ زاشی کے

لیے کچھ چاکلیٹس لایا تھا اور وہ بار بار چاکلیٹس کھانے کی ضد کر رہی تھی۔ مول اسے چاکلیٹ نہیں دے رہی تھی کیونکہ وہ

ایک بار پھر ہاتھ اور منہ گندا کر لیتی۔ وہ اسے بیڈ پر بٹھا کر چند منٹوں کے لیے کسی کام سے کچن میں گئی تھی اور جب وہ

واپس آئی تو زاشی چاکلیٹ کھا رہی تھی، شاید اسفند نے اسے چاکلیٹ کھول کر تھما دیا تھا۔

مول کو یک دم غصہ آیا اور اس نے زاشی کے ہاتھ سے چاکلیٹ لے کر دور پھینک دیا۔ اور پھر ایک زوردار تھپڑ

اس کے منہ پر مارا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے ایک اور تھپڑ مارتی۔ اسفند نے تیزی سے اس کا اٹھتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”یہ تمنا کافی ہو چکا ہے۔ اب اسے شتم ہو جانا چاہیے۔“ اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔

”میرا ہاتھ چھوڑو۔“

اس نے اس کا ہاتھ چھوڑنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔

”تم آئندہ اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گی۔“

اس نے ایک بار پھر ایک چاکلیٹ کھول کر روٹی ہوئی زاشی کو تھما دیا۔

مول غم و غصے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی پھر یک دم چیخ پڑی۔ ”تم کون ہو۔ تے ہو مجھے روکنے والے؟“

”میں اس کا باپ ہوں اور میں اب یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اب اس پر کوئی ہاتھ اٹھائے گا تو میں

وہ ہاتھ توڑ دوں گا۔“

وہ اتنے تلخ لہجے میں بات کر رہا تھا کہ مول کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے نظر ملانے

بغیر بات کرتا تھا اور اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے مقابل کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر

کمرے سے چلی گئی۔ اس رات اسے رہیہ کی ساری باتیں یاد آئی تھیں۔

انگلے ماہ وہ گھر نہیں آیا اور پھر دو ماہ کے وقفہ کے بعد گھر آیا تھا۔ اس رات وہ حسب معمول زاشی کو اس کے

پاس چھوڑ کر بیڈروم میں جانے لگی تو اس نے کہا۔

”آج تم اسے بیڈروم میں سلا دو اور اسے سلانے کے بعد یہاں آنا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

وہ اس کے لہجے سے کچھ کھلک گئی۔ زاشی کو سلانے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن اس کے سامنے جانے کے لیے

ہمت پیدا کرنے میں اسے کافی وقت لگا۔ وہ جی کڑا کر کے بیڈروم سے نکل آئی۔

اسفند نے خاموشی سے اسے آتے اور سامنے صوفے پر بیٹھتے دیکھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس

نے کہا۔

”میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ایک لمحے کے لیے مول کا سانس رک گیا۔

”اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دو اور اگر تم مجھے دوسری شادی کی

اجازت نہیں دینا چاہتے تو پھر میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور میرے خیال میں یہ بہتر ہے کہ تم مجھ سے طلاق لے لو۔

تمہیں مجھ سے نفرت ہے اور شاید تم حق بجانب ہو۔ میں اپنی پوری کوشش کے باوجود تمہارے دل میں اپنے لیے جگہ

پیدا نہیں کر سکا۔ ایسے رشتہ کو قائم رکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ میں نے جب تم سے شادی کی تھی تو کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ

کبھی مجھے تمہیں طلاق دینا پڑے گی۔ میں اس رشتہ کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔ تم اپنے

دل میں اتنی وسعت پیدا نہیں کر سکتیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید کر تمہارے نام کر دیا ہے، یہ اس کے کاغذات

ہیں۔ یہ بارہ لاکھ کا چیک ہے۔ دو لاکھ حق مہر کے ہیں اور دس لاکھ میں تمہیں اور دے رہا ہوں تاکہ تمہیں کوئی مالی

پریشانی نہ ہو۔“

اس نے میز پر کچھ کاغذات رکھ دیے۔

”جہاں تک زاشی کا تعلق ہے تو اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم اس سے محبت کرو گی اور اس پر پوری توجہ دو گی تو تم

بس ایک داغِ ندامت

اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔ میں اس کا خرچہ تمہیں بھجواتا رہوں گا۔ دوسری صورت میں میں اسے اپنے پاس رکھ لوں گا۔ اور میرے خیال میں اس کے حق میں یہی بہتر ہے کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ مانوس ہے۔ ویسے بھی اس کی موجودگی میں شاید تمہیں اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنے میں کچھ مسئلہ ہو۔“

”اور اگر میں طلاق نہ لوں تو؟“ مول کو اپنی آواز کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”جب بھی صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی۔ بس یہ ہوگا کہ میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا لیکن میں پہلے کی طرح یہاں نہیں آؤں گا اور مجھے اپنے والدین سے یہ بات چھپانی پڑے گی کہ میں نے تمہیں طلاق نہیں دی۔ بہر حال آخری فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے تم صبح ربیعہ کو بلاو اور اس کے ساتھ مشورہ کر لو۔“

مول وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں آگئی۔ مول کو اسفند سے نفرت تھی لیکن پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس سے علیحدگی اختیار کر کے وہ ایک بار پھر آسمان سے زمین پر آگرے گی۔ اسے اپنی حماقتوں کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پارہی تھی۔

دوسری صبح اس نے فون کر کے ربیعہ کو بلوایا۔ ربیعہ جس وقت آئی اس وقت اسفند ناشتہ کر رہا تھا اور وہ ناشتہ کرنا شروع کر رہی تھی۔ اسفند نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا اور اسے ناشتہ کی آفر کی لیکن ربیعہ نے انکار کر دیا۔

”کیا بات ہے؟ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ کیا تم دونوں کے درمیان پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟“ اس نے مول سے کچھ متفکر ہو کر پوچھا تھا۔

”نہیں! اب کوئی جھگڑا نہیں ہوگا کیونکہ میں اسے طلاق دے رہا ہوں اور دوسری شادی کر رہا ہوں۔“

ربیعہ کو اس کی بات پر جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ مول کچھ کہے بغیر سے ہوئے چہرے کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”اسفند! تم یہ کیسے کر سکتے ہو؟“

”تمہیں مجھ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں بلکہ میری ہمت کی داد دینی چاہیے کہ میں نے اب تک ایسا کیوں نہیں کیا۔“

”اسفند! تم ناشتہ کرنے کے بارے میں سوچو، وہ.....“

”میں نے اس کا سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ یہ طلاق اس کے لیے بھی بہتر رہے گی۔“

”اسفند! کیا تم مول کو ٹھوکرین کھانے کے لئے چھوڑ دو گے؟“

”میں اسے ٹھوکرین کھانے کے لیے نہیں چھوڑ رہا۔ میں اسے ایک گھر اور بارہ لاکھ روپے دے رہا ہوں

اسے اور کچھ چاہیے تو وہ بھی دے دوں گا۔“

”وہ اکیلی کیسے رہے گی؟“

”وہ رہ لے گی۔ اسے اکیلے رہنا پسند ہے۔“ اس کے پاس جیسے ربیعہ کے ہر سوال کا جواب تھا۔

”ایسا مت کرو اسفند! اپنا گھرتاہ مت کرو۔“ ربیعہ نے لجا جنت سے کہا تھا اور وہ یک دم جیسے پھٹ پڑا۔
 ”گھر..... کون سا گھر؟ مجھے بتاؤ ربیعہ! کون سا گھرتاہ ہو گا۔ کیا یہ گھر ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہے؟ یہ تو صرف
 رہنے کا ایک ٹھکانا ہے۔ میرا گھر تو وہ تھا جو میں نے آج سے چار سال پہلے ایک حماقت کی وجہ سے کھو دیا تھا۔ اب مجھے اپنا
 گھر ہی تو واپس حاصل کرنا ہے۔“

”اسفند! تم.....“ ربیعہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اسفند نے اس کی بات کاٹ دی۔
 ”میری بات سنو ربیعہ! آج صرف میری بات سنو۔ تم مول کی دوست تو نہیں تھیں۔ صرف معمولی سی جان
 پہچان تھی پھر بھی تم نے صرف اس لیے اس کا ساتھ دیا کیونکہ تم اسے بے قصور سمجھتی تھیں آج تم انصاف کرو اور پھر اگر
 مجھے قصور وار پانچ تو میرا ساتھ نہ دینا۔ میں نے دو سال میں یونیورسٹی میں جو عزت، جو نام حاصل کیا تھا وہ اس نے پھینچ مار
 کر ختم کر دیا تھا۔ مجھے تکلیف نہ ہوتی اگر وہ الزام صحیح ہوتا جو اس نے مجھ پر لگایا تھا لیکن میری کوئی غلطی نہیں تھی پھر بھی
 اس نے میری اسلف کی دوسروں کے سامنے مجھے تماشانا بنایا۔ جو کام میں نے کیا وہ غلط تھا۔ میں تب بھی کہتا تھا۔ آج
 بھی کہتا ہوں۔ میں اپنی اس حرکت کو کبھی صحیح نہیں کہوں گا۔ مگر وہ صرف جنون میں آ کر کیا تھا میں نے اور جب میرا غصہ
 ختم ہوا تو میرا پچھتاوا شروع ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تم دونوں کے کہنے پر اس سے فوراً شادی کر لی تھی۔ تب
 میں نے تم سے یہی کہا تھا کہ میں نے اپنے بچے کے لیے شادی کی ہے۔ میں اس کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ بچ
 نہیں تھا۔ میں نے اپنے بچے کے لیے نہیں بلکہ اس کی زندگی بچانے کے لیے اس سے شادی کی تھی۔ میں نے ایک جرم
 کیا تھا اور میں اس کا کفارہ ادا کر دینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس غلط حرکت کی وجہ سے اس کی پوری زندگی
 مبرا ہو جائے۔ تب میری منگنی کو تین سال ہو چکے تھے نوشین سے بے تمنا شامت کرنے کے باوجود میں نے اسے چھوڑ
 دیا، کیا یہ آسان کام تھا؟ پھر میرے والدین نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے زندگی میں کبھی پانی کا گلاس بھی اپنے
 ہاتھ سے نہیں لیا تھا لیکن اس کیلئے میں تین تین جاہز کرتا رہا۔ خود دیکھ لکھانا اور خوار ہونا رہا لیکن میں نے اسے کوئی
 تکلیف نہیں ہونے دی۔

میں نے اسے ہر چیز مہیا کی چاہے مجھے اس کے لیے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرنی پڑی صرف اس لیے کیونکہ
 میں شرمندہ تھا۔ میں اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہتا تھا اور اس سب کے بدلے میں مجھے کیا ملا؟ ذلت، ذہنی اذیت بے
 سکوئی۔ ان چار سالوں میں اس نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ کبھی میری شرٹ پر پٹن تک لگانے کی زحمت نہیں کی میں
 کب گھرا آتا تھا۔ کب جاتا تھا۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

وہ معمولی باتوں پر مجھ سے جھگڑتی، زاشی کو مارتی۔ میں بے بسی سے دیکھتا رہا۔ میں نے اسے کبھی نہیں روکا۔
 لیکن اب میں تھک چکا ہوں۔ میں بہت سزا کاٹ چکا ہوں۔ اب ایک نارٹل زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ایسی
 بیوی کی ضرورت ہے جو میرا خیال رکھے جسے میری پروا ہو جو مجھ سے محبت کرے جس کے ساتھ میں اپنی پرابھو شیئر کر
 سکوں جو میری کامیابیوں پر خوش ہو جسے میری ضرورت ہو اور مول یہ سب نہیں کر سکتی۔ میں نے نوشین سے زاشی کے

بس ایک داغِ ندامت

بارے میں بات کی ہے وہ اسے ساتھ رکھنے پر تیار ہے اور میرے لیے اتنا کافی ہے۔“
وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ربیعہ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ کیا کہتی یہ سب کچھ وہی تھا جس سے وہ وقتاً فوقتاً مول کو روکتی رہی تھی۔

”مجھے تم سے اور تمہارے روپے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی بیٹی چاہیے۔ مجھے زاشی چاہیے۔“

وہ پتا نہیں کس وقت بیڈروم سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح اکھڑا تھا۔
”میں زاشی کو اسی صورت میں تمہیں دے سکتا ہوں جب تم میرے دیے ہوئے گھر میں رہو۔ تم اپنے لیے روپیہ لینا چاہتی ہو یا نہیں۔ وہ تمہاری مرضی ہے مگر میں زاشی کو تمہارے ساتھ دھکے کھانے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔“
”میں جیسے چاہوں گی اسے رکھوں گی وہ میری بیٹی ہے۔“
”آج پہلی بار خیال آیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے اس سے پہلے تم نے کبھی یہ کیوں نہیں سوچا۔ اس سے پہلے تو تم ہمیشہ اسے مصیبت کہتی تھیں۔“ وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔

”میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتی۔ میں جو چاہوں گی۔ کروں گی۔“
”مول! اگر اس طرح ضد کرو گی تو تمہیں مجھ سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔“
”میں تمہاری ہر چیز پر لعنت بھیجتی ہوں لیکن زاشی میری ہے۔ میں وہ تمہیں نہیں دوں گی۔“
”تم اگر اس گھر میں رہو تو.....“

”میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“ وہ ایک دم چلائی۔

”ٹھیک ہے پھر میں زاشی کو تمہیں نہیں دوں گا۔ میں نہیں چاہتا وہ تمہارے ساتھ دھکے کھائے تم اسے دے کیا سکتی ہو۔ تمہارے پاس کوئی چاب نہیں ہے اور اگر کوئی چھوٹی موٹی چاب کر بھی لو تو بھی ان دو چابز سے تم کیا کرو گی۔ گھر اور دوسری چیزوں کے کرائے بھرو گی، خرچ چلاؤ گی یا زاشی پر خرچ کرو گی۔ اگلے سال وہ سکول جانا شروع کر دے گی اور تمہارے پاس ہے اتنا روپیہ کہ اسے کسی اچھے سکول میں داخل کروا سکو۔ مان لو مول! تم اسے کچھ نہیں دے سکتیں۔ اسے میرے پاس رہنے دو۔ تم جب بھی اس سے ملنا چاہو گی۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔“ مول یک دم اٹھ کر بیڈروم میں چلی گئی۔ ربیعہ نے اس کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے۔

”اسفند! میں مانتی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ذرا سوچو۔ طلاق دے کر تم اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر رہے؟ ایک طلاق یا فیتہ لڑکی کی معاشرے میں کیا عزت ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو۔ مجھے بتاؤ۔ وہ کس طرح اکیلی رہے گی۔ تم اسے ایک موقع اور دو۔“

”نہیں ربیعہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں اسے دس ہزار مواقع دوں تو بھی اس کے روپے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ تم خود دیکھ لو کیا اسے کوئی پشیمانی یا شرمندگی ہے؟ اور ویسے بھی میں نوشین سے

بس ایک داغِ ندامت

شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم شادی کر لو لیکن مول کو طلاق مت دو۔“

”ربیعہ! یہ فیصلہ تم مت کرو تم اس سے بات کرو اگر وہ اس پر تیار ہو اور یہ بات چھپائے کہ میں نے اسے

طلاق نہیں دی تو میں تمہاری بات مان لوں گا لیکن پہلے تم اس سے بات کرو۔“

وہ ربیعہ سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ ربیعہ اندر بیڈروم میں چلی آئی اور جو اس کے دل میں آیا۔ اس نے مول کو

کہہ دیا۔ اس وقت اسے مول پر کچھ اتنا ہی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے اس کی ساری پیش گوئیوں کو سچ ثابت کر دیا تھا۔ مول

خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ پھر ربیعہ نے اس کے سامنے اپنی تجویز رکھ دی تھی اور یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی جب وہ

بلا تامل اس کی بات مان گئی۔

”میں نے تمہیں ہزار دفعہ سمجھایا تھا کہ اپنی عادتوں کو بدل ڈالو۔ ماضی کو بھول جاؤ لیکن تم نے سب کچھ گنوا کر

دم لیا۔ میں تمہیں اب بھی کہتی ہوں۔ اپنا رویہ بدلو۔ اس پر توجہ دو۔ شادی تو اب اس نے کر ہی لیٹی ہے لیکن تم اسے یہ

موقع نہ دو کہ وہ تمہیں اور زاشی کو بالکل ہی بھول جائے۔“

مول خاموشی سے اس کی نصیحتیں سنتی رہی۔ اس کے سوا وہ اب کربھی کیا سکتی تھی۔

اسفند پندرہ دن بعد دوبارہ آیا تھا اور اس بار اس نے پہلی بار مول کے رویے میں تبدیلی دیکھی۔ اس رات

پہلی بار اس نے ٹیبل پر اس کے لیے کھانا لگایا تھا اور کھانے کے بعد خود ہی اسے چائے تیار کر کے دی۔ اگلی صبح پہلی بار

اسے اپنے کپڑے خود پر بس نہیں کرنے پڑے وہ پہلے سے ہی ہاتھ روم میں لٹکے ہوئے تھے۔ اسے اس کے رویے میں

اتنی معمولی سی تبدیلی بھی بہت اچھی لگی تھی۔ اس دن واپس ملتان جانے سے پہلے وہ نوشین سے ملا تھا اور اس نے اسے

اپنے فیصلے کے بارے میں خود ہی سب کچھ بتا دیا وہ اسے کسی دعوے کے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ نوشین اس کی بات سن کر

یک دم بگڑ گئی۔

”اسفند! میں دوسری بیوی بن کر رہنا نہیں چاہتی۔ میں شراکت میں زندگی نہیں گزار سکتی۔“

”نوشین! یہ ٹھیک ہے کہ میں اسے طلاق نہیں دوں گا لیکن میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ تم میرے

پاس رہو گی، وہ بیٹیں لاہور میں رہے گی۔“

”اسفند! میں اس معاملے میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔“

اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

اسفند اسے قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ صرف اس صورت میں شادی پر تیار تھی جب وہ مول کو

طلاق دے دیتا۔ وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ گھر والوں کی طرف سے بھی اس پر مول کو طلاق دینے اور نوشین سے

شادی کے لیے دباؤ تھا اور وہ جیسے دورا ہے پر کھڑا تھا۔

وہ اب مول کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نے اپنے رویے کو بڑی حد تک بدل لیا تھا۔ اب وہ بات

بس اک داغِ ندامت

بے بات اس سے الجھتی نہ تھی اور اس کی چھوٹی موٹی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ اس نے اسفند کے اعتراضات کو بڑی حد تک دور کر دیا تھا۔ انہیں دنوں اس نے مول اور زاشی کو پرانے فلیٹ سے ایک نئے فلیٹ میں شفٹ کر دیا تھا۔ اس نے زاشی کو ایک مائیسوری میں داخل کروا دیا تھا اور وہ مائیسوری پرانے فلیٹ سے بہت فاصلے پر تھی۔ نیا فلیٹ ایک گلزری فلیٹ تھا۔ نیا فلیٹ نہ صرف مکمل طور پر فرفر شدہ تھا بلکہ اس میں کمروں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ ٹوشین سے اس کی ملاقاتیں ویسے ہی جاری تھیں لیکن وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی وہ مول کی موجودگی میں اس سے شادی کرنے کو تیار نہ تھی۔ اور اسفند کے لیے اب مول کو طلاق دینا مشکل ہو گیا تھا۔

ان ہی دنوں زاشی کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ مول نے سوچا کہ شاید موسم کی تبدیلی کی وجہ سے وہ بیمار ہو گئی ہے۔ اس لیے اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن جب اسفند گھر آیا تھا تب تک اس کی طبیعت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ وہ اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور وہیں پتا چلا تھا کہ اسے برقان ہے۔ اور مرض کافی بگڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر ایڈمٹ کر لیا۔ اسفند اس کی حالت دیکھ کر کافی پریشان تھا۔ اور اسی پریشانی میں وہ ٹوشین کے ساتھ اس روز دوپہر کا لُچ بھی بھول گیا۔ ٹوشین نے اس کے نہ آنے پر جب اسے فون کیا تھا تب وہ کھینک پر تھا۔ اسفند نے اسے زاشی کی حالت کے بارے میں بتایا تھا لیکن وہ بھر بھی اصرار کر رہی تھی کہ وہ لُچ کے لیے آئے۔ اس کی ضد پر اسفند کو بے اختیار رخصت آیا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں نہیں آ سکتا پھر بھی تم ضد کر رہی ہو۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں اپنی بیٹی کو اس حالت میں چھوڑ کر تمہارے ساتھ لُچ کرنا پھروں؟“

ٹوشین اس کے لہجے پر دنگ رہ گئی تھی۔ ”تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟ کیوں چلا رہے ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہیں اپنے لُچ کی پڑی ہے یہ احساس نہیں کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ اگر وہ تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا پھر بھی تم اسے اس طرح چھوڑ کر مجھے ہول میں لُچ کرنے کے لیے بلواتیں۔“

”بھائو میں جاؤ تم اور تمہاری بیٹی“ ٹوشین خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔

”مائسڈ یور لینگویج۔ میں نہیں جانتا تھا۔ تم اس قدر پاگل ہو سکتی ہو۔“

”کیا پاگل پن دکھایا ہے میں نے؟ وہ صرف بیمار ہے مری تو نہیں ہے جو تم اس طرح سوگ میں بیٹھ گئے

ہو۔“

”ٹوشین! مجھے دوبارہ فون مت کرنا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں نہ تمہاری شہل دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اسفند نے مٹی سے فون بچ دیا۔

ٹوشین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک نہی ہی بچی کے لیے اس طرح اس کی بے عزتی کر سکتا ہے۔ دوسری طرف اسفند بھی اس کی باتوں پر بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ٹوشین اس سے اس طرح بات کرے گی اس کا خیال تھا کہ وہ زاشی کی خیریت دبا دیا مت کرے گی اور شاید اسے دیکھنے آ جائے لیکن اس نے رسمی طور پر بھی اس کا

بس ایک داغِ ندامت

حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور اس بات نے اسفند کے دل میں ایک گرہ سی لگا دی۔ وہ ایک بار پھر اس سے شادی کے فیصلے پر سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ مول کا وجود زاشی کے لیے کتنا ضروری ہے۔ وہ جیسی بھی تھی بہر حال اس کی ماں تھی اور جو احساسات وہ زاشی کے لیے دل میں رکھتی تھی۔ وہ کوئی دوسری عورت نہیں رکھ سکتی تھی۔ دو دن زاشی ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی تھی پھر ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کر دیا۔

وہ دونوں دن لاہور میں ہی رہا تھا۔ اس بیماری نے ایک بار پھر اسے زاشی سے بہت قریب کر دیا تھا۔ وہ اس کے لیے سب کچھ تھی بیٹی دوست، ساتھی سب کچھ۔ شروع شروع میں وہ صرف اپنی غلطی کی تلافی کے طور پر اسے زیادہ توجہ دیتا تھا لیکن بعد میں اس نے نامحسوس طور پر اسے اپنا گرویدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ دوستوں سے کم ملتا تھا ماں باپ سے وہ کٹ چکا تھا۔ مول اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ صرف زاشی تھی جو اسے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ اس کی انگلی پکڑ کر کھیلتی اس کے چہرے کو چھوتی۔ اس کی باتوں کے جواب میں منہ سے آوازیں نکالتی۔ اسفند کو یوں لگتا پوری دنیا میں اگر کسی کو اس کی پروا ہے تو وہ زاشی ہے۔ بعد میں ماں باپ سے میل جول اور نوٹیشن سے ہونے والی ملاقاتوں نے بھی اس محبت کو کم نہیں کیا تھا۔

اسفند نے دو بارہ نوٹیشن سے خود رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت دن تک اس کے فون کا انتظار کرتی رہی اور پھر ٹھک آ کر اس نے خود ہی اسے کال کیا تھا۔ لیکن اسفند کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اسے بہت کچھ کہا تھا اور پھر آخر میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”میں ایک ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا جو میری بیٹی کو پسند نہیں کرتی۔ تم میری طرف سے آزاد ہو جہاں دل چاہے شادی کر لو۔“

بہت سے فیصلے کرنا بہت مشکل لگتا ہے لیکن جب انسان وہ فیصلہ کر لیتا ہے تو سب کچھ جیسے آسان ہو جاتا ہے۔ ایک بار پہلے اس نے نوٹیشن کو مول کی خاطر چھوڑا تھا۔ دوسری بار اس نے اسے زاشی کی خاطر چھوڑ دیا تھا۔

☆

اس شام وہ دونوں ربیعہ کو چھوڑنے اور پورٹ گئے تھے۔ وہ انگلینڈ چلی گئی تھی اور اتر پورٹ پر اسے سی آف کرتے وقت مول کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ فاطمہ سے پہلے ہی اس کا رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا اور اب ربیعہ بھی چلی گئی تھی اور اس سے بھی جلد ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔ واپسی پر گاڑی ڈرائیور کرتے ہوئے اسفند اس کی خاموشی کو محسوس کر رہا تھا۔ زاشی اس کی گود میں بیٹھی مسلسل باتیں کر رہی تھی۔

”پاپا! پتا ہے ربیعہ آئی ہے۔ کہا ہے کہ وہ میرے لیے انگلینڈ سے بہت سے چاکلیٹس لائیں گی۔ اور رنر بھی اور فرانس بھی اور انہوں نے پراس کیا ہے کہ وہ میرے لیے ایک بڑا سا پلیٹین لے کر آئیں گی آپ والے سے بھی بڑا۔“

وہ اسفند سے ربیعہ کے وعدے ڈسکس کر رہی تھی۔ مول خاموشی سے کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ اسے آج ربیعہ اور فاطمہ کی ایک ایک بات ایک ایک احسان یاد آ رہا تھا۔ اور ہر یاد سے طول کر رہی تھی۔ اسفند اس کی کیفیات

سے بے خبر نہیں تھا۔ ناشی کو گھر جاتے ہی ہوم ورک کا خیال آ گیا۔

”ماما! آپ مجھے ہوم ورک کروائیں۔“

اس سے پہلے کہ مول کچھ کہتی اسفند بول اٹھا۔

”بیٹا! آج ہم آپ کو ہوم ورک کروا دیتے ہیں۔ آپ اپنی ماما کو سونے دیں۔“

وہ خاموشی سے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ تقریباً ساری رات روتی رہی تھی۔ دوسرے دن وہ صبح پانچ بجے اٹھی تھی کیونکہ اسفند کو جلدی جانا تھا۔ وہ اس وقت ناشتہ تیار کر رہی تھی جب وہ کچن میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رات کو سوئی نہیں ہے۔

”رہیہ کے جانے کا بہت افسوس ہو رہا ہے تمہیں؟“

وہ ڈائمنگ ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی جب اسفند نے اسے مخاطب کیا تھا۔ مول خاموشی سے اپنا کام کرتی

رہی۔

”مول! وہ ہمیشہ تو تمہارے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو اسے واپس جانا ہی تھا۔ لیکن وہ دوبارہ

بھی تو آئے گی اور اگر تم چاہو تو آئندہ چھٹیوں میں اس کے پاس انگلیٹڈ چلی جانا۔“

وہ بڑے نرم لہجے میں اسے چیزا پ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بمشکل خود پر ضبط کر رہی تھی۔ اس کی بات

پر پیک دم ڈائمنگ ٹیبل پر بازو کا کرور نے لگی۔

چند لمحوں بعد اسے اپنے بالوں پر اس کے لمس کا احساس ہوا تھا۔ اور عجب بات یہ تھی کہ مول کو یہ لمس بُرا نہیں

لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا وہ خود بھی بے حد عجیب سے جذبات سے دوچار ہو رہا تھا۔ پھر

مول نے پیک دم سر اٹھایا دونوں کی نظریں ملیں اور مول تیزی سے اٹھ کر کچن سے نکل گئی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر

وہ بھی غیبت سے چلا گیا۔ وہ ایک جذباتی لحد تھا جو دونوں کے درمیان کوئی آہٹ کیے بغیر گزر گیا تھا۔ مول کو بعد میں خود

پر بے تماشاً غصہ آیا تھا کہ وہ اتنی کزور کیسے پر گئی کہ اس کے سامنے رونے لگی۔ اسے خود پر بہت افسوس ہوا تھا۔

☆

اس کی لاہور آمد و رفت میں ایک تسلسل سا آ گیا تھا۔ وہ تقریباً ہر ایک اینڈ پر گھر ضرور آیا کرتا تھا۔ اس دن

وہ ناشی کو اس کریم کھلانے کے لیے باہر لے کر گیا ہوا تھا۔ مول رات کا کھانا تیار کر رہی تھی جب ڈور بیل بجی۔ مول

نے دروازہ کھولا تو ایک عورت کا اجنبی چہرہ اس کے سامنے تھا۔

”تم مول ہو؟“ بہت عجیب سے لہجے میں اس عورت نے کہا تھا۔ وہ اس عورت کی زبان سے اپنا نام سن کر

قدر سے حیران ہوئی۔ کالی ساڑھی میں ملبوس بالوں کا جوڑا بناے وہ عورت اٹھتر عمر ہونے کے باوجود بے حد خوبصورت تھی۔

”ہاں میں مول ہوں۔ آپ کون ہیں؟“

”میں اسفند کی مدر ہوں۔“ اس عورت نے بڑی رعونت سے کہا تھا۔

بس ایک داغِ ندامت

”آپ اندر آ جائیں۔“ وہ دروازے سے ہٹ گئی۔

”تم نہ بھی کہتیں۔ تب بھی میں اندر آ جاتی۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔“
وہ نخوت سے کہتی ہوئی اندر آ گئی تھیں۔ مول نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔
”آپ بیٹھیں۔“

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔ اسفند سے علیحدگی کے بدلے میں کیا لوگی؟ بولو کیا لوگی؟ جو مانگو گی میں تمہیں دوں گی صرف اس کا پیچھا چھوڑ دو تم اس کے قابل نہیں ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ تم سے پیچھا چھڑائے۔ تم اسے چھوڑ دو۔ اور اس کے بدلے میں جو چاہتی ہو لے لو۔“
مول نے سکون سے ان کی بات سنی۔

”آپ اسفند کی ماں ہیں میں اس رشتے سے آپ کی عزت کرتی ہوں مگر آپ ایسی باتیں نہ کریں جن سے میرے دل میں آپ کے لیے عزت ختم ہو جائے۔“
عزیزین حسن اس کی بات پر بھڑک اٹھیں۔ ”مجھے تم جیسی عورتوں سے عزت نہیں چاہیے۔ میں نے تمہیں ایک بہت مناسب آفر کی ہے تم مجھے اس کا جواب دو۔“
”مگر میں آپ کو ایک بلیٹنگ چیک دوں اور آپ کو اپنا گھر چھوڑنے کے لیے کہوں تو آپ کیا یہ آفر قبول کریں گی؟“

اس کی بات پر عزیزین حسن آگ بگولہ ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتیں فلیٹ کے ادھ کھلے دروازے کو کھول کر اسفند اندر داخل ہوا۔ وہ زاشی کی انگلی تھامے ہوئے تھا۔ اپنی ماں پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے ہکا بکا رہ گیا۔
عزیزین حسن نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مول سے کہا۔
”اپنا مقابلہ مجھ سے مت کرو۔ میں تمہاری طرح بد کردار آوارہ اور مردوں پر ڈورے ڈالنے والی نہیں ہوں۔“ مول کا چہرہ ان کی بات پر سرخ ہو گیا۔

”مئی! آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔“ اسفند یک دم آگے بڑھ آیا تھا۔
”کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔ میں تو اس کو اس کا غلیظ چہرہ دکھا رہی ہوں۔“
”مئی! کافی ہو گیا۔ اب آپ خاموش ہو جائیں۔ کیا آپ جانتی ہیں آپ جس کے بارے میں یہ سب کچھ کہ رہی ہیں وہ میری بیوی اور میری بیٹی کی ماں ہے۔“ اسفند نے تلخ لہجے میں ماں سے کہا تھا۔
”تمہاری بیٹی۔ کون سی بیٹی؟“ عزیزین حسن نے حقارت بھرے لہجے میں زاشی کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا شہوت ہے کہ یہ تمہاری بیٹی ہے؟“

”مئی! آپ بس یہاں سے چلی جائیں۔ میں آپ کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔“
”یہ میرے شوہر کی کمائی کا فلیٹ ہے تمہاری کمائی کا نہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ تمہیں شرم آنی

بس ایک داغِ ندامت

چاہیے کہ تم اپنے باپ کا روپیہ ایسی عورتوں پر لٹا رہے ہو۔ یہ اس قدر سستی سا وتری ہوتی تو اپنے ماں باپ کے گھر ہوتی۔ یہاں نہ ہوتی۔ اس نے کہا کہ یہ تمہاری بیٹی ہے اور تم فوراً اس پر جان چھڑکنے لگے۔ کیا دنیا میں تم سے بڑا احمق کوئی اور ہے۔ ایسی عورتوں کے ہزاروں چاہنے والے ہوتے ہیں۔ تمہارے جیسوں کی انہیں جب ضرورت پڑتی ہے جب انہیں اپنی اولاد کو نام دینا ہوتا ہے۔ تم نے اسے اپنی اولاد مان لیا لیکن ہم لوگ نہیں مانیں گے۔ تمہاری اولاد وہی ہوگی جس کی ماں کوئی خاندانی عورت ہوگی۔ گھر سے بھاگی ہوئی اس جیسی لڑکی نہیں۔ یہ بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا کہ جسے تم اپنی بیٹی کہہ رہے ہو۔ اسے ہمارا خاندان کبھی قبول نہیں کرے گا۔ تم کسی باعزت خاندان میں اس کی شادی نہیں کر سکو گے۔“ وہ اسے یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔ مول سرخ چہرے کے ساتھ ہونٹ کاٹتے ہوئے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

اسفند مرد تھا۔ مرد کے دل میں بدگمانی ہمیشہ بچکی کی طرح آتی ہے جب تک اس کی ماں وہاں تھی وہ مول کا دفاع کر رہا تھا لیکن ان کے جاتے ہی وہ مول سے بدگمان ہونے لگا تھا۔

”مئی جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ ناممکن تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے زاشی میری نہیں واقعی کسی اور کی بیٹی ہو اور مول نے مجھے اندھیرے میں رکھا ہو۔“ اس کا ذہن یک دم شبہات سے بھر گیا تھا۔ زاشی اس کے پاس آ کر اس کی ناگوں سے لپٹنے لگی۔ اس نے اسے دو روٹھکیل دیا۔

”میرے پاس مت آؤ۔ اندر جا کر سو جاؤ۔“

زاشی تو باپ کے رویے پر حیران تھی مگر مول جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔ اس نے پہلی بار اسفند کو زاشی کو اس طرح جھڑکتے دیکھا تھا۔ اسفند اچانک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل آن بیٹھا۔

”مول! تم اپنی بیٹی کی قسم کھا کر کہو کہ وہ واقعی میری اولاد ہے؟“

بچکی گرتی تو شاید مول کو اتنا شاک نہ لگتا جتنا اس کے اس ایک جملے سے لگا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہیں بول پائی اور اس کی اس خاموشی نے اسفند کے اضطراب میں اضافہ کر دیا تھا۔

”تم مجھے بتاؤ، کیا زاشی میری اولاد ہے؟“

”یہ سوال تم خود سے کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ وہ کس کی اولاد ہے۔ یہ تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

”مول! میں تمہارے بارے میں سب کچھ نہیں جانتا۔ جب میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا تو تم اپنے گھر گئی تھیں لیکن انہوں نے تمہیں نہیں رکھا۔ تمہارے بقول تم ربیبہ اور فاطمہ کے ساتھ رہی تھیں۔ لیکن میں نہیں جانتا۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں ہو سکتا ہے تم کسی اور.....“

وہ اپنے شبہات کو زبان دے رہا تھا۔ مول نے اسے روک دیا۔

”اتنا کافی ہے۔ تمہیں اگر یہ لگتا ہے کہ زاشی تمہاری بیٹی نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اسے لے کر کل یہاں

سے چلی جاؤں گی لیکن تم اپنی گندری زبان بند رکھو۔“

زاشی حیرت اور خوف کے عالم میں ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ جھگڑے کی نوعیت تو سمجھ نہیں پارہی تھی لیکن اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس کے ماں باپ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مول نے زاشی کو گود میں اٹھا لیا۔

”آؤ زاشی! تمہیں سلا دوں۔“ اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے اس نے کہا۔

”نہیں ماما! میں تو پاپا کے پاس سوؤں گی۔“ زاشی نے ضد کی تھی۔

”یہ تمہارے پاپا نہیں ہیں۔ تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔“

وہ تلخ لہجے میں کہہ کر اسے بیڈروم میں لے آئی۔ اسے کاٹ میں لٹانے کے بعد اس نے اپنا ایک بیگ نکالا اور اس میں اپنے کچھ کپڑے رکھ لیے۔ پھر ایک اور بیگ نکال کر وہ بیڈروم سے نکل آئی۔ اسفند ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دوسرے بیڈروم میں آئی اور زاشی کے کپڑے بیگ میں رکھنے لگی۔ واپس اپنے بیڈروم میں آ کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ ربیعہ اور فاطمہ تو اب یہاں تھیں نہیں اور ان دونوں کے علاوہ وہ کسی اور سے مدد کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ اسی اویسٹر بن میں پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں آہٹ ہو رہی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ زیر و پاؤر کے بلب کی روشنی میں اس نے اسفند کو زاشی کے کاٹ پر جھکا ہوا دیکھا تھا۔ بیڈ کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس وقت وہاں کیا کر رہا تھا۔ وہ دبے قدموں سے کاٹ کی طرف آئی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی بھیگی ہوئی آواز اس کے کانوں میں اترتی گئی تھی۔

”تمہارا باپ دنیا کا غلط ترین آدمی ہے، وہ اس قابل نہیں تھا کہ تم اس کے گھر میں پیدا ہوتیں، پھر بھی پھر بھی میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں اس کے گناہوں کی سزا دے۔“

وہ زاشی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے خود کلامی کر رہا تھا۔ مول بنا آہٹ واپس پلٹ گئی۔ اسے اس طرح دیکھ کر اسے عجیب سا سکون ملا تھا۔ باقی رات وہ اطمینان سے سوئی تھی۔

اسفند شاید ساری رات نہیں سو یا تھا۔ اس لیے صبح جب وہ اٹھ کر کچن میں آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔

”مجھے چائے بنا دو۔“ وہ کہتے ہوئے وہیں ڈائمنگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مول نے کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھا اور پھر چائے کا ایک کپ تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

”کل رات جو کچھ ہوا۔ میں اس کے لیے تم سے ایکسکیوز کرنا ہوں۔ میں تمہیں ہرے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

مول سر دنگروں سے اسے دیکھتی رہی۔ ”کیا تمہیں یقین آ گیا ہے کہ زاشی تمہاری بیٹی ہے؟“

”مول! میں اپنے الفاظ کے لیے ایکسکیوز کر چکا ہوں۔ اب دوبارہ یہ بات مت کہنا۔ میں چاہتا ہوں تم

دونوں میرے ساتھ ملتان چلو۔ میں تم دونوں کو اب اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔“
مول بے تاثر چہرے سے اسے دیکھتی رہی پھر کچن سے باہر آ گئی۔

☆

ایک ہفتہ بعد وہ ملتان شفٹ ہو گئی تھی۔ پہلی رات وہ زاشی کے ساتھ سوئی تھی مگر اگلی صبح اسفند نے اس سے کہا۔
”تم زاشی کا بیڈروم الگ سیٹ کرو اور تم خود میرے کمرے میں سویا کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ ملازم تمہیں الگ
کمرے میں رکھے ہوئے دیکھ کر میرے یا تمہارے متعلق کوئی بات کریں۔ تم اگر الگ بیڈروم میں رہو گی تو یہ بات ان
سے چھپی نہیں رہے گی۔“

”وہ جو چاہے سوچیں اور جو چاہیں کہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ مول نے صاف انکار کر دیا تھا۔
”تمہیں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسفند نے کچھ عجیب سے لہجے میں اس سے کہا۔ وہ
اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

”میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں اپنے ذہن سے یہ خوش فہمی نکال دو۔“

اس نے تلخ لہجے میں اس سے کہا۔ اسفند خاموش ہو گیا۔ اس کی بات مول کو ایک چیلنج کی طرح لگی تھی۔ وہ
اگلے دن اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئی۔ پہلے کچھ دن وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی اسے واقعی اسفند سے خوف محسوس ہوتا
تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کا خوف ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسفند ویسے بھی رات کو دیر سے گھر آتا اور آتے ہی
اسٹڈی میں فائلز دیکھنے بیٹھ جاتا۔ رات کے دو بجے وہ کمرے میں آتا اور اس قدر تھکا ہوا ہوتا کہ چند منٹوں میں ہی سو
جاتا تھا۔

”میں جا ب کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ چند ہفتے وہاں رہی تھی اور بے زار ہو گئی تھی۔ لاہور میں گھر کے کاموں میں
اس کا وقت گزر جاتا تھا لیکن یہاں پر ملازم ہونے کی وجہ سے اسے سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ وہ بے مقصد
سارا دن گھر میں پھرتی رہتی اور چند دنوں میں ہی اس پر ایک بار پھر ڈپریشن کے دور سے پڑنے لگے تھے۔ اسے سارا دن گھر
میں رہنا مشکل لگنے لگا تھا اور اس رات اس نے اسفند سے بات کر ہی لی تھی۔

”کس لیے؟“ وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ ”میرا خیال ہے۔ تمہیں روپے کی تو کمی نہیں ہے۔“

”جا ب صرف روپے کے لیے نہیں کی جاتی۔ میں خود کو مصروف رکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ٹھک کر کہا۔
”مصروف رکھنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ تم کلب جوائن کر لو۔ یہ جوائن فیکشنز کے کارڈز آتے
ہیں وہاں جایا کرو۔“

”نہیں۔ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں بس جا ب کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے اپنی بات پر
اصرار کیا۔

”میں تمہارے ساتھ بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن میں تمہیں جا ب کرنے نہیں دوں گا۔“ وہ سونے کے لیے بیڈ

بس ایک داغِ ندامت

پر دراز ہو گیا۔

”میں تم سے اجازت نہیں مانگ رہی ہوں، صرف تمہیں اطلاع دے رہی ہوں۔ مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں تمہارے کافی نا زخروے برداشت کر چکا ہوں اور نہیں کر سکتا۔ تم سے شادی کر کے میں پہلے ہی بہت سے مسائل سے دوچار ہوں۔ تم میرے لیے مزید مصیبتیں کھڑی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں میری اجازت کی ضرورت ہے یا نہیں لیکن اس شہر میں تم میری مرضی کے بغیر کام نہیں کر سکتیں، تم جاہز ڈھونڈتی رہو گی اور میں تمہیں وہاں سے لٹکواتا رہوں گا۔ اس لیے بہتر ہے تم آرام سے گھر پر رہو۔“

مول نے ایک شاک کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ اسفند کے لہجے سے اسے اپنی تذبذبل کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ اس سے چاب کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے دن اسی طرح گزرنے لگے تھے لیکن اب وہ پہلے کی طرح گھر پر نہیں رہتی تھی۔ اس نے اپنے لیے بہت سی سرگرمیاں تلاش کر لی تھیں۔ اسفند اور اس کے درمیان تعلقات کی نوعیت اب بھی وہی تھی۔ وہ اب بھی اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھی۔

☆

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا تھا۔ زاشی اب نو سال کی ہو چکی تھی۔ اسفند نے اسے لاہور میں ایک ہاسٹل میں داخل کروایا ہوا تھا کیونکہ مختلف شہروں میں پوسٹنگ ہونے کی وجہ سے وہ بار بار اس کا سکول تبدیل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسفند پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ مول اور گھر کے معاملے میں وہ کافی لاپرواہ اور سردہر ہو گیا تھا۔ مول کے ساتھ اس کے رویے میں وہ پہلے جیسی نرمی نہیں رہی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح خاموشی سے اس کی باتیں نہیں سنتا تھا۔ بلکہ اسے جھڑک دیتا تھا۔

فیصل آباد میں اس کی پوسٹنگ کو ایک سال ہونے والا تھا جب اچانک اسے اسفند بہت بدلا ہوا لگنے لگا تھا۔ وہ یک دم بہت پرسکون اور مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ مول نے شروع میں اس تبدیلی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن بہر حال وہ ایک عورت تھی جو پچھلے دس سال سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ ان تبدیلیوں کی وجہ کوئی عورت ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پریشان رہنے لگی تھی۔ اسفند کے معمولات میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ پہلے جب وہ کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا تو ہمیشہ اسے پہلے سے مطلع کر دیتا تھا۔ لیکن اب وہ مول کو مطلع نہیں کیا کرتا تھا۔ ایک رات وہ گھر سے غائب تھا جب اچانک اس کے لیے آفس سے کال آ گئی تھی۔ پولیس نے کہیں ریڈ کیا تھا اور کسی اشتہاری ملزم کو پکڑ لیا تھا اور اب ایس پی صاحب کو بلا لیا جا رہا تھا۔

”وہ گھر پر نہیں ہیں۔“ آپریٹر نے کال مول سے ملا دی تھی اور اس نے اسفند کے بارے میں بتا دیا تھا۔

”پھر وہ کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں۔“

”ٹھیک ہے ہو سکتا ہے وہ پیڑونگ پر ہوں۔ ہم پتا کر لیتے ہیں لیکن اگر وہ گھر آ جائیں تو انہیں فوراً کمشنر آفس بھجوا دیں۔“ بولنے والے نے اس سے کہا تھا۔

مول نے فون بند کر دیا۔ پھر وقفے وقفے سے فون آتے رہے لیکن اسٹند کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ صبح چار بجے کے قریب آیا تھا۔ مول نے اسے پیغام پہنچا دیا۔ وہ فوراً واپس چلا گیا۔ جب دوپہر کو وہ واپس آیا تھا تو اس نے ایک فون نمبر ڈائری پر لکھ کر اس سے کہا تھا۔ اگر کبھی میرے لیے کوئی سچ آئے اور میں موبائل پر ریسیو نہ کروں تو اس فون نمبر پر مجھے انفارم کرو۔“

مول کا دل چاہتا تھا وہ اس سے پوچھے کہ وہ کبھی رات کہاں تھا۔ یہ تو اسے کنفرم ہو گیا تھا کہ وہ کسی سرکاری کام پر نہیں تھا۔ کچھ ہفتے اسی طرح سے گزر گئے۔ پھر ایک رات وہ اسی طرح گھر نہیں آیا۔ اور ڈپٹی کمشنر کے گھر سے اس کے لیے کال آئی تھی۔ کچھ لوگوں نے ڈی سی ہاؤس پر فائرنگ کی تھی۔ مول نے موبائل پر اسے رنگ کیا۔ لیکن شاید موبائل آف تھا۔ پھر اسے اس نمبر کا خیال آیا تھا اور اس نے اس نمبر پر رنگ کیا۔ کچھ دیر تک بیل ہوتی رہی پھر کسی عورت نے ریسیو راٹھایا۔

”ہیلو کون بول رہا ہے؟“ اس کی آواز میں غنودگی نمایاں تھی۔ یوں جیسے وہ ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ مول کو چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ اس کے بدترین خدشے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

”اسٹند حسن سے بات کروائیں۔“

اس عورت کی آواز سے یک دم غنودگی کے آثار غائب ہو گئے۔ ”یہ اسٹند حسن کا گھر نہیں ہے۔ آپ نے غلط نمبر پر رنگ کیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں یہ اسٹند حسن کا گھر نہیں ہے مگر وہ پھر بھی ہمیں ہے۔ آپ اسے بتادیں کہ ڈی سی ہاؤس سے اسے کال کیا گیا ہے۔“

مول نے اس عورت سے کہا۔ اس بار کچھ توقف کے بعد اس نے ریسیور پر اسٹند کی آواز سنی۔ اسے اپنے اندر جوار بھانا سا اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے پیغام دے کر فون بند کر دیا۔ مول دوبارہ سو نہیں پائی۔ وہ صبح نو بجے گھر آیا تھا اور اسے دیکھ کر مول کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”وہ عورت کون تھی؟“

”جو بھی تھی بہر حال یہ اطمینان رکھو وہ میری بیوی نہیں تھی۔“

مول کو اس کے جواب پر اور غصہ آیا تھا۔

”اگر وہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو پھر تم وہاں کس.....“ اسٹند نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تم سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ تمہیں میری زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”تمہیں خود پر شرم آتی چاہیے۔ تم آج سے دس سال پہلے بھی جانور تھے آج بھی جانور۔“

”تم اپنا منہ بند رکھو۔“

اسفند نے سرخ چہرے کے ساتھ اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”تمہیں اسفند حسن تمہیں کوڑے لگنے چاہیں۔ پھانسی دے دینی چاہیے تمہیں۔“

”پچھلے دس سال سے پھانسی ہی تو دی جا رہی ہے مجھے۔“ تلخ لہجے میں اس کی بات کا جواب دے کر اس نے

اپنی جینٹ اتار کر بیڈ پر اچھال دی۔

”تم ایک بیٹی کے باپ ہو۔ تمہیں اپنا نہیں تو اس کا احساس ہونا چاہیے۔“

”میں تمہارے اور زاشی کے لیے اور قربانیاں نہیں دے سکتا۔ میں تلخ آگیا ہوں تم دونوں کی پروا کر کر

کے۔ میں تلخ آگیا ہوں اس زندگی سے۔ یہ زندگی نہیں ہے یہ عذاب ہے۔“

وہ اس کی بات پر بلند آواز سے چلا یا تھا۔

”اس عذاب کا انتخاب تم نے خود کیا تھا۔“

”ہاں خود کیا تھا لیکن ہن سال کسی غلطی کی تلافی کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ میں اب اپنی زندگی کو اپنے طریقے

سے گزارنا چاہتا ہوں۔ اس زندگی پر میرا بھی حق ہے۔ میں اپنی پوری زندگی کو ایک ایکسکیو زینا کر گزارنا نہیں چاہتا۔“

وہ واٹس روم میں چلا گیا۔ مول ساکت کھڑی اسے جانا دیکھتی رہی۔

☆

سازہ سے اسفند کی ملاقات جمیر آف کامرس میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں ریسپنڈنٹ تھی اور اس میں کوئی ایسی

بات تھی جو مردوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیتی تھی۔ اسفند کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ دو چار بار اسے جمیر آف کامرس

جانا پڑا اور سازہ کی پر سنائی اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ سازہ اچھی عورت نہیں ہے اور اسفند

واحد آدی نہیں تھا جس پر وہ اپنے التفات کا اظہار کرتی تھی مگر اسفند کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے

اس سے میل جول بڑھاتا گیا اور پھر آہستہ آہستہ بات کافی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ سازہ کے گھر پر راتیں گزارنے لگا

تھا۔ وہ ایک پوش علاقے میں ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتی تھی اور ایک ریسپنڈنٹ اس علاقے میں رہائش کس طرح

افورڈ کر رہی تھی۔ یہ تقریباً سب ہی جانتے تھے لیکن پھر بھی اس کے پاس آنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی تھی۔

اسفند اس کا نیا شکار تھا بس فرق یہ تھا کہ یہ شکار سب کچھ جانتے بوجھتے اس کے جال میں پھنسا تھا۔

مول ایک بار پھر دورا ہے پر کھڑی تھی۔ ماضی ایک بار پھر اپنی بھیما تک صورت میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے اب اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا۔“

وہ دس سال کے بعد فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ”مجھے ایک بار پھر اپنی فیملی کے پاس جانا چاہیے ان

سے بات کرنی چاہیے۔ دس سال پہلے میں کمزور تھی بات نہیں کر سکتی تھی لیکن اب کر سکتی ہوں۔“

☆

بس ایک داغِ ندامت

اس دن وہ زاشی کو لاہور ہاسٹل چھوڑنے گئی تھی اور اسی دن وہ وہاں سے واپس فیصل آباد آنے کے بجائے اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اسے یاد تھا دس سال پہلے بھی وہ ایک بار اسی طرح اس گھر میں گئی تھی تب اس کی زندگی اور عزت داؤد پر لگی ہوئی تھی۔ دس سال بعد آج پھر وہ اسی دلہیز پر کھڑی تھی۔ تب اس گھر نے اسے پناہ نہیں دی تھی اور آج لرزتے ہاتھ سے اس نے کال تیل بھائی تھی۔ اندر قدموں کی آہٹ ابھری تھی۔ پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ اسے کچھ بھی پہچاننے میں دیر نہیں گئی تھی۔ دروازہ کھولنے والے کا بھی یہی حال تھا۔ چند لمحوں تک ایک عجیب سی خاموشی تھی جو دونوں کے بیچ جاگل رہی تھی۔

”مول تم تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ سہیل بھائی جیسے اپنے حواس میں واپس آ گئے تھے آنسوؤں نے اس کے چہرے کو بھگونا شروع کر دیا۔

”آپ نے مجھے ڈھونڈا کیوں نہیں؟ آپ نے مجھ سے جان کیوں چھڑائی۔ میں کیا اتنی بوجھ ہو گئی تھی آپ پر۔“ وہ جیسے چلا اٹھی تھی۔

”تمہیں اگر اپنی پسند سے شادی کرنا تھی تو تم ہم سے بات کر سکتی تھیں۔ کون سی خواہش تھی مومی! جو ہم نے تمہاری پوری نہیں کی تھی پھر کیوں اس طرح ہماری عزت مٹی میں ملا کر چلی گئیں۔“

انہوں نے اس پر دروازہ بند کیا تھا نڈاسے باہر نکالا تھا۔ وہ اس سے شکوہ کر رہے تھے۔

”میں کیا ایسی تھی کہ اپنی مرضی سے شادی کے لیے گھر سے بھاگ جاتی۔ مجھے تو کسی اور لڑکی کی غلط فہمی میں اغوا کر لیا گیا تھا اور جب انہیں پتا چلا تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں گھر آئی تھی مگر بھائی نے مجھے گھر سے نکال دیا۔“

مول میں سچ بتانے کی ہمت نہیں تھی اس نے دس سال پہلے فاطمہ کا گھڑا ہوا جھوٹ بھائی کے سامنے دوہرا دیا۔ ”پھر میں اپنی دوست فاطمہ کے پاس چلی گئی کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی جان بچان کے لوگوں میں میری شادی کروا دی۔“

سہیل بھائی جیسے حیرت زدہ تھے۔

”تم یہاں آئی تھیں مگر کب؟ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔“ انہوں نے حیرانی سے کہا تھا۔ وہ بیٹھی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی۔

چند لمحے اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد انہوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ ”آؤ اندر آ جاؤ۔“ ان کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔ برستی آنکھوں کے ساتھ وہ اندر آ گئی تھی۔

باقی کے مرحلے اس سے بھی آسان ثابت ہوئے تھے۔ گھر میں کافی دیر جھگڑا ہوتا رہا تھا بھائی اور بھائی کے درمیان اور پھر یک دم ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ جب بھائیوں کو یہ پتا چلا تھا کہ اس کا شوہر کیا کرتا ہے۔ چند لمحوں میں ان کے رویے بدل گئے تھے۔ انہوں نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی تھی جو مول نے فراخ دلی سے دے دی تھی۔ اسے کبھی بھی بھائیوں یا بھائیوں سے شکوہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس نے کبھی انہیں اپنی بربادی کا ذمہ دار سمجھا تھا۔

بس اک داغِ ندامت

اسے اسفند کے علاوہ اور کوئی مجرم نظر نہیں آتا تھا۔ پھر وہ ماضی کھنگالنے کیسے بیٹھ جاتی۔ اس کے لیے تو یہ ہی بہت بڑی بات تھی کہ اس کے بھائیوں نے اسے معاف کر دیا تھا نہ صرف معاف کر دیا تھا بلکہ اس کی گھڑی ہوئی کہانی سن کر وہ شرمسار ہوئے تھے اور ایک بار پھر اس کے لیے اس گھر کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

دس سال میں پہلی دفعہ وہ اتنا ہنسی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ ساری دنیا کو بتا دے کہ وہ ایک بار پھر سے دنیا میں واپس آ گئی ہے۔ اس کی جلا وطنی کا حکم واپس لے لیا گیا تھا۔ وہ رات کی فلائٹ سے واپس فیصل آباد آ گئی تھی۔ اس نے اسفند کو اپنے بھائیوں سے ہونے والی اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

مول کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دس سال کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئی ہو اس کے سینے پر جو بوجھ تھا۔ وہ ہٹ چکا تھا۔ پہلی دفعہ اسے اپنا وجود اسفند کے مقابلے میں بے دست و پا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی خوشی اور مسرت کا احساس اس کے اندر جاگزیں ہوا تھا۔ اسفند کو اس کے اندر آنے والی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ورنہ شاید وہ کچھ چونکتا ضرور۔

☆

اس دن ملازم نے مول کو کسی عورت کے آنے کی اطلاع دی تھی اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے کافی لوگ ملنے آتے رہتے تھے۔ کچھ اسفند سے کوئی کام کروانے کے لیے اور کچھ مختلف فنکشنز کے دعوت نامے لے کر۔ اس نے اس عورت کو بھی ایسا ہی کوئی ملاقاتی سمجھا تھا۔ ملازم کو اس نے اس عورت کو ڈرائیونگ روم میں بٹھانے کے لیے کہا اور خود بالوں میں برش کرنے لگی۔ چند منٹوں بعد وہ ڈرائیونگ روم میں چلی آئی اور ڈرائیونگ روم میں اس نے جس چہرے کو دیکھا تھا اس نے صحیح معنوں میں اس کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ وہ رہیہ تھی وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے گلے لگی تھی اور پھر جو اس نے رونا شروع کیا تو اسے چپ کرواتے کرواتے رہیہ بھی رونے لگی۔ اچھی طرح آنسو بہا لینے کے بعد وہ اسے اوپر اپنے بیڈ روم میں لے آئی تھی۔ اسے اپنے بیڈ روم میں بٹھانے کے بعد وہ نیچے ملازم کو چائے کے بارے میں ہدایات دینے آئی تھی۔ جب وہ واپس گئی تو رہیہ اسفند کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی زاشی اور اسفند کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

”زاشی ہے یا یہ؟ دیکھو میں نے پہچان لیا۔ پہلے سے بھی نیا وہ بیاری ہو گئی ہے۔“

مول اس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی۔

”کہاں ہے یہ؟“

”لاہور میں پڑھتی ہے۔ بورڈنگ میں ہے۔“ وہ رہیہ کے پاس بیٹھ گئی۔

”اور باقی سچے کہاں ہیں؟“ مول نے حیرانگی سے رہیہ کا چہرہ دیکھا۔

”رہیہ! کیا..... کیا اس کی گنجائش تھی؟“

رہیہ جیسے شاک کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

”مومل! کیا تم اب بھی..... تم کیا چیز ہو مومل؟“

”بس رہیہ! یہ سب چھوڑو۔ تم بتاؤ۔ پاکستان کب آئی ہو؟“ مومل نے بات کا موضوع بدل دیا۔ رہیہ چند لمحے خاموش ہی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔

”دو سال ہوئے ہیں پاکستان میں شفٹ ہوئے۔ اب واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ مومل تاسف سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”دو سال ہو گئے ہیں تمہیں پاکستان آئے ہوئے اور تم نے ایک بار بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی اور میں چھ سال سے ہر ماہ تمہیں خط لکھتی رہی ہوں۔ ایک دو سال خط کا جواب دینے کے بعد تم نے اس تکلف کی بھی زحمت نہیں کی اور اب یہاں آنے کے بعد بھی تمہیں میری یاد نہیں آئی۔“ مومل کو صحیح معنوں میں دکھ ہوا تھا۔

”بس یارا! کیا بتاؤں۔ میں کس قدر مصروف ہو گئی تھی۔ تمہیں پتا ہی ہے شادی اور اس کے بعد کی ذمہ داریاں پھر میں خود بھی جا ب کرتی ہوں تو فرصت اور بھی کم ہی ملتی ہے۔ لیکن دیکھو اب جب فرصت ملی ہے تو سب سے پہلے تمہارے پاس ہی آئی ہوں۔“

”کتنے بچے ہیں تمہارے؟“

”تین بیٹیاں ہیں۔ دو کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ جزواں ہیں اور ایک اور ہے۔“

”کیا کر رہی ہو آج کل؟“ مومل نے ملازم کے آنے پر چائے بنا تے ہوئے پوچھا۔

”جا ب کر رہی ہوں ایک گورنمنٹ ہاسپٹل میں۔“

”تم اپنے بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لائیں؟ میں انہیں دیکھ ہی لیتی۔“

”بس یارا! ابھی وہ تینوں چھوٹی ہیں۔ اتنے لمبے سفر میں کیسے سنبھالتی۔“ مومل سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے رہیہ نے کہا۔

”تم اپنے شوہر کو ساتھ لے آتیں پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔“

”انہیں کہاں سے لاتی۔ وہ تو انگلینڈ میں ہی ہیں۔ وہ ابھی کچھ سال وہیں رہیں گے۔ میں تو اس لیے پاکستان آ گئی ہوں تاکہ سچے یہاں سیٹ ہو جائیں وہاں بڑے ہوں گے تو بعد میں یہاں ایڈجسٹ ہونے میں انہیں مشکل ہوگی۔“ مومل نے اس کی بات پر سر ہلا دیا۔

”فاطمہ سے کوئی رابطہ ہے؟“ مومل نے اس سے پوچھا۔

”ہاں وہ بھی پاکستان آ چکی ہے۔ اس کے فادران لاکی ڈیھڑ ہو چکی ہے۔ اسی کے شوہر کو کاروبار سنبھالانا تھا۔ اس لیے انہیں بھی واپس آنا پڑا۔ کراچی ہوتی ہے وہ۔“ رہیہ نے تفصیل سے اسے بتایا۔

”اور اس نے بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے لگتا ہے تم دونوں مجھ سے ملنا چاہتی ہی نہیں تھیں۔“ مومل کی زبان پر ایک بار پھر شکوہ آیا تھا۔

”نہیں۔ ایسی بات نہیں تھی۔ جب بھی ہم دونوں ملتی تھیں۔ تمہارا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ لیکن ہم دونوں کے پاس تمہارا باقاعدہ پتا نہیں تھا۔ اس لیے ملنے کی کوشش کیا کرتے پھر مصر و نیت اتنی تھی کہ ہم چاہتے ہوئے بھی تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر سکے۔ اب جب کچھ فرصت ہوئی تو میں نے اسفند کی موجودہ پوسٹنگ کا پتا کروایا اور تمہارے پاس آ گئی۔“

ربیعہ نے جیسے وضاحت کی، گو مول اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی، لیکن اس نے موضوع بدل دیا۔
”اس کے بھی تین بچے ہیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔“

مول اس سے بہت سی باتیں کرتی رہی اور انہیں باتوں کے دوران اس نے ربیعہ کو بتایا کہ وہ دوبارہ اپنے بھائیوں سے ملنے لگی ہے۔ اس اطلاع پر ربیعہ نے زیادہ خوشی یا جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔
”مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر تمہارے اور اسفند کے تعلقات ٹھیک ہو گئے ہوتے۔“

اس نے ایک جملے میں جیسے بات ختم کر دی تھی۔ رات کو ربیعہ کی ملاقات اسفند سے بھی ہوئی تھی۔ چھ سال پہلے جب وہ انگلینڈ گئی تھی۔ آج کا اسفند اس وقت کے اسفند سے بالکل مختلف تھا۔ بے حد شجیدہ، بہت کم مسکرائے والا، ہلکی آواز میں رک رک کرنے والا۔ اس کی آنکھوں کی وہ چمک منفقو دہنی جو لوگوں کے دلوں کو مسحور کر لیا کرتی تھی۔ وہ تو جیسے سرتاپا پچھتاوا تھا۔

ربیعہ کو اس پر بے اختیار ترس آیا۔ لیکن بہت سے مسائل ترس کھانے سے حل نہیں ہوتے۔ وہ جان بوجھ کر اس سے زاشی کے بارے میں بات کرتی رہی اس کے چہرے پر ابھرنے والی چند مدہم مسکرائیں اسی ایک نام کی بدولت تھیں۔

اگلے روز وہ شام کو واپس چلی گئی تھی۔ اس نے اس بار مول کو کوئی نصیحت، کوئی ہدایت نہیں کی تھی اور اس بات پر مول کو کچھ حیرانگی ہوئی تھی لیکن وہ مطمئن تھی کہ ربیعہ اب پہلے کی طرح اس پر دباؤ نہیں ڈال سکتی۔

مول اب اکثر لاہور جایا کرتی تھی۔ اپنے بھائیوں سے ملنے کے علاوہ وہ ربیعہ سے بھی ملتی رہتی تھی۔ اسفند کو بھی بہت جلد پتا چل گیا تھا کہ وہ اپنے گھر آنے جانے لگی ہے لیکن اس نے مول سے کچھ پوچھنے یا کہنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چند بار زاشی کو بھی اپنے ساتھ اپنے بھائیوں کے گھر لے کر گئی تھی۔ لیکن زاشی وہاں جا کر زیادہ خوش نظر نہیں آئی۔ وہ کسی کے ساتھ زیادہ کس اپ نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے مول کے اصرار کے باوجود وہ جانے پر ناخوش ہی رہتی تھی۔

☆

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ زاشی ویک اینڈ پر گھر آئی ہوئی تھی اور رات کے کھانے کے بعد اسفند تیار ہو کر کہیں جانے لگا تھا۔ جب مول نے ترس لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ اسفند نے ٹی وی دیکھتی ہوئی زاشی کی طرف دیکھا۔

”مجھے کام ہے۔“ کچھ ناگوار سی سے اس نے مول کو جواب دیا تھا۔

”کیا کام ہے؟“

”یہ تمہیں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے۔ تم اسی عورت کے پاس جا رہے ہو۔“

اس بار مول کی آواز بہت بلند تھی۔ زاشی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسفند نے زاشی کو دیکھتے ہوئے دہمی آواز میں اس سے کہا۔

”اس طرح تماشا کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی کے پاس نہیں جا رہا۔ زاشی کے سامنے اس طرح کی باتیں مت کرو۔“

”کیوں نہ کروں۔ اسے پتا چلنا چاہیے کہ اس کا باپ کیا ہے اور اس کے کفو ت کیا ہیں۔“

مول کی آواز اور تیز ہو گئی تھی۔ اس بار اسفند بھی بھڑک اٹھا۔

”تم اپنا منہ بند کرو۔ میں تم سے کسی قسم کی بکواس سننا نہیں چاہتا۔“

”کیا چاہتی ہو تم؟ بناؤ کیا چاہتی ہو؟ زندگی کو عذاب تو پہلے ہی بنا دیا ہے اب باقی کیا رہ گیا ہے جسے بگاڑنا چاہتی ہو؟“

”میں نے نہیں تم نے عذاب بنا دیا ہے۔ اپنی نہیں میری زندگی کو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے۔ تمہاری عیاشیاں تو اسی طرح جاری ہیں۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟“

”زاشی! اٹھو۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

اسفند نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے زاشی سے کہا جو حیرانی سے اس جھگڑے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی۔ مول نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔

”زاشی یہاں سے نہیں جائے گی۔ جو کچھ ہوگا اس کے سامنے ہی ہوگا۔ اپنی اصلیت کیوں چھپانا چاہتے ہو اس سے؟ اپنا بھیا تک چہرہ کیوں نہیں دکھانا چاہتے اسے؟“ مول کے لہجے میں صرف زہر تھا۔

”میں تم پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا ہوں۔ بہتر ہے تم خاموش ہو جاؤ۔“

”نہیں، میں خاموش نہیں رہوں گی۔ تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔ مارنا چاہتے ہو مارو اور میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔ گھنیا آدمی۔“ مول نے بہت زور سے چلا کر کہا تھا۔

”اما پلیز آپ چلا مت کریں۔ آپ پاپا سے آرام سے بات کر سکتی ہیں۔“

اس سے پہلے کہ اسفند اس کی بات کا کوئی جواب دیتا۔ زاشی نے ایک دم بڑی ناگواری سے اس سے کہا تھا۔

”میں چلا رہی ہوں اور تمہارا باپ کیا کر رہا ہے۔“ اس کی بات پر مول کا خون اور کھول اٹھا تھا۔

”پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔ جھگڑا ہمیشہ آپ شروع کرتی ہیں آپ پاپا سے بدتمیزی کرتی ہیں۔ آپ کو تو ہمیشہ.....“

”زاشی خاموش ہو جاؤ۔ میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔ تم جاؤ یہاں سے۔“ اسفند نے اس کی بات

کاٹ دی۔ زاشی کچھ روہنسی ہو کر کمرے سے نکل گئی اس بار مول نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

”تم میری بیٹی کے دل میں میرے خلاف زہر بھر رہے ہو۔“

”یہ زہر تم خود اپنے رویے سے اس کے دل میں بھر رہی ہو۔ وہ اب چھوٹی سی بچی نہیں ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہ

سکے۔ تم ابھی بھی اس کے دل میں اپنی عزت برقرار رکھنا چاہتی ہو تو اپنے رویے کو بدل لو۔“

”میں لعنت سمجھتی ہوں تم پر اور تمہاری بیٹی پر، اور ایسی عزت پر میں اب اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں

مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ تم جیسے غلیظ انسان کے ساتھ دس سال گزار لیے۔ کافی ہیں اب تم اس گھر میں اس عورت کو لے

آؤ جس کے لیے تم پاگل ہو رہے ہو۔ تمہاری بیٹی کو بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کا باپ کتنا شریف انسان ہے۔“

وہ بڑے صبر اور سکون سے اس کی باتیں سنتا رہا یوں جیسے وہ یہ سب کسی اور کے بارے میں کہہ رہی تھی۔

”جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے بھائی تمہیں کتنی دیر اپنے پاس رکھتے ہیں

دس سال بعد ملے ہیں۔ کم از کم دس دن تو رکھنا ہی چاہیے۔“

مول اس کی بات سن کر چیخ اٹھی۔

”میرے بھائیوں کے بارے میں ایک لفظ مت کہو ورنہ تم سے ہزار درجے بہتر ہیں۔“

”مانتا ہوں وہ مجھ سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ کم از کم وہ یہ تو فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا تم

سے جان چھڑانا انہیں بہتر لگا۔ انہوں نے جان چھڑائی۔ تم سے تعلق جوڑنا انہیں فائدہ مند لگا۔ انہوں نے جوڑ لیا۔

تمہارے عظیم بھائی۔“

وہ اب باہر جانے کا ارادہ ترک کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کھڑکی سے گھورتی رہی۔

”مجھے طلاق چاہیے ابھی اور اسی وقت۔“ اسفند کے سکون میں کوئی کئی نہیں آئی۔

”دے دوں گا۔ تمہارا یہ شوق بھی پورا کر دوں گا لیکن ابھی نہیں پہلے مجھے اپنی بیٹی کی کہنیں شادی کر لینے دو۔

اس کے بعد میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ بس دس سال اور انتظار کر لو۔“

”دس سال؟ میں تو اس گھر میں ایک منٹ اور نہیں رہ سکتی۔ نہیں اسفند حسن! تمہیں میں اب برداشت نہیں کر

سکتی۔ تم طلاق نہ دو۔ میں خود تم سے طلاق لے لوں گی۔“

وہ عجیب سی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ”میں زاشی کو تمہیں نہیں دوں گا۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہ خوش فہمی کیسے ہوئی کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔

مجھے زاشی کا عذاب نہیں چاہیے۔ اسے اپنے پاس رکھو اور جو چاہے اس کے بارے میں فیصلہ کرو۔ میں دوبارہ پلٹ کر

اس کے بارے میں پوچھنے تک نہیں آؤں گی۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر وہ اٹھ کر ڈرینگ روم میں چلا گیا۔

اگلی صبح آٹھ بجے اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسفند آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس

بس اک داغِ ندامت

کی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس نے مول سے کچھ کہا نہیں بلکہ خاموشی سے نیچے ہاشتہ کرنے چلا گیا۔ وہ جس وقت اپنا بیگ اٹھا کر نیچے آئی۔ اس وقت زاشی اور اسفند ہاشتہ کر رہے تھے۔

”اما! آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ زاشی اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ اس نے سر و نظروں سے اسے دیکھا۔
”میں جہنم سے نکل کر جنت میں جا رہی ہوں۔ تمہیں میں بری لگتی تھی اس لیے اب تمہارا باپ تمہارے لیے نئی ماں لائے گا جو تمہارے باپ سے کبھی بدتمیزی نہیں کرے گی نہ اس پر کبھی چلائے گی۔“ وہ زاشی کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

گیٹ عذرا بھابھی نے کھولا تھا اور اسے دیکھ کر حیرانی اور سرت کا اظہار کیا۔
”بھئی مول! یہ بیگ کس لیے لائی ہو؟“ بھابھی نے اس کے بیگ کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ جو یہ تہیہ کر کے آئی تھی کہ وہ بھابھی کو جانتے ہی سب کچھ بتا دے گی اور ان سے کہہ دے گی کہ اس نے گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ان کے سوال پر بے اختیار جھجک گئی۔

”بھابھی! اس بار میں رہنے آئی ہوں۔ میرا دل چاہتا تھا۔ آپ کے پاس کچھ دن گزارنے کو۔ اس لیے میں آگئی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”تو زاشی کو بھی لے آتیں۔“

”نہیں۔ اسفند کو اچھا نہیں لگتا زاشی کا کہیں رہنا۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے بورڈنگ میں ہی رکھا جائے۔ ویسے بھی میں تو آرام کرنے آئی ہوں۔ زاشی کے ساتھ تو پھر بہت سے کام ہوتے۔“

اس نے جھوٹ پر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ عذرا بھابھی نے کوئی اور سوال نہیں کیا مول نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے کئی بار اسفند سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن مول ہر بار یہ کہہ کر نال دیتی کہ اسفند کو اس کا اپنے بھائیوں سے ملنا پسند نہیں ہے کیونکہ اسے لگتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔

سہیل بھائی نے کئی بار اس سے کہا کہ وہ اسفند سے مل کر یا اس سے فون پر بات کر کے اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دیتے ہیں لیکن مول نے ہمیشہ انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ اسفند بہت سخت ہے شاید وہ یہ بھی پسند نہ کرے اور مول کے لاہور جانے پر بھی پابندی لگا دے۔ اس کے بھائی مجبوراً اس کی بات مان گئے تھے۔

مول کو لاہور آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اور یہ پورا ہفتہ کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس سے ملنے آتا رہا۔ وہ دماغ کو کتنا بھی جھٹلاتی، چانتی تھی میل ملاپ کے اس سلسلے کی وجہ ایس پی اسفند حسن تھا۔ مول منیر نہیں۔ اسے یاد تھا وہ ان ہی لوگوں کے گھروں میں دس سال پہلے پناہ لینے کے لیے باری باری گئی تھی اور ان میں سے ہر ایک نے مقدر و بھر اس کی بے عزتی کی تھی اور آج..... اسے یہ سوچ کر زرا دیتی تھی کہ جب وہ ان سب کو بتائے گی کہ وہ اسفند حسن کو چھوڑ چکی ہے یا جب وہ اسے طلاق نامہ ججوائے گا تو کیا ہوگا؟ کیا پچھلے روپے پھر سے واپس آ جائیں گے۔ وہ سوچتی اور

بس ایک داغِ ندامت

اس کا دم کھٹنے لگتا۔

اس دن وہ گھر چھوڑ دینے کے بعد پہلی بار ربیعہ کے ہاں گئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور ربیعہ چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھی۔ مول بھی اس کے ساتھ کام نہاتی رہی پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے ربیعہ کو بتا دیا کہ وہ اسفند کا گھر چھوڑ آئی ہے اور وہ اسے طلاق دینے کا بھی کہہ چکی ہے۔ ربیعہ کو اس کی بات پر جیسے کرنٹ لگا تھا۔

”تمہارے بھائیوں کو پتا ہے اس بارے میں؟“ اس نے مول سے پوچھا۔

”نہیں۔ مگر میں انہیں جلد ہی بتا دوں گی۔“

”پھر کیا وہ تمہیں پاس رکھ لیں گے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ وہ مجھے ضرور رکھیں گے اور اگر نہ بھی رکھیں تو بھی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میں اپنے لیے خود ہی کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔“

”دس سال اس کے ساتھ رہنے کے بعد آخراپ ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ تم نے اس طرح اپنا گھر اور بیٹی چھوڑ دی؟“ ربیعہ کو جیسے ابھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”بس میں اب وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ ربیعہ! ان دونوں کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں پھر میں وہاں کیوں رہتی۔ وہ شخص۔ وہ شخص سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے گناہ کی تلافی کر دی ہے۔ اب میرا اس پر کوئی قرض ہی نہیں رہا۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پتا نہیں وہ کن کن عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ مجھے اس کے وجود سے گھن آتی ہے۔ اسے اپنی کسی بھی حرکت پر شرمندگی نہیں۔ وہ بڑی ڈھنائی سے سب کچھ کرتا ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے رہوں؟“

”مول! تم دس سال پہلے بھی احمق تھیں۔ آج بھی بے وقوف ہو پہلے بھی ما قابل اصلاح تھیں آج بھی ہو۔ اس شخص نے تمہارے اور زاشی کے لیے کیا نہیں کیا پھر بھی.....“

”ربیعہ! میرے اندر ایک ایسا الاؤ ہے جس میں اس کی تمام مہربانیاں اپنا کوئی نقش چھوڑے بغیر رکھ ہو جاتی ہیں۔ اس نے جو میرے ساتھ کیا تھا۔ میں کبھی وہ سب بھول سکتی ہوں نہ اسے معاف کر سکتی ہوں۔“

مول نے ربیعہ کی بات کاٹ دی تھی۔

”اس کو معاف نہیں کر سکتیں تو اپنے آپ کو کیسے معاف کر دیا۔ تم اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کی خود ذمہ دار تھیں۔ وہ سب کچھ تمہاری غلطی سے ہوا تھا۔ تمہاری جلد بازی اور بے وقوفی سے ہوا تھا۔ تمہاری زندگی اگر برباد ہوتی تھی تو اسفند کی بھی ہوتی ہے۔ دس سال اگر تم نے جہنم میں گزارے ہیں تو اس نے بھی گزارے ہیں۔ کبھی تم نے اس کے چہرے کو دیکھا ہے۔ یہ وہ چہرہ تھا جس نے پہلی بار دیکھنے پر مجھے اور فاطمہ کو مبہوت کر دیا تھا اور اب! اب وہ کیا ہے؟ اگر اس کے عورتوں کے ساتھ تعلقات ہیں اور تمہارے بقول وہ عیش کر رہا ہے تو پھر تو اس کے چہرے پر اطمینان

اور سکون ہونا چاہیے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور غرور ہونا چاہیے لیکن وہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اتنی بے چینی اتنا اضطراب نہیں دیکھا جتنا اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں خوف نہیں دیکھا اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ وہ ہر وقت اسی عذاب میں رہتا ہوگا کہ کہیں تم زاشی کو یا کسی اور کو وہ سب نہ بتا دو۔ کہیں تمہاری کوئی بات زاشی کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا نہ کر دے۔ یہاں کتنے مرد ایسے ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے اور تم مولیٰ! تم وہ خوش قسمت ہو جسے خدا نے ایک بار پھر سے زمین پر کھڑا ہونے کا موقع دیا لیکن پتا نہیں کیوں تمہیں پاتا ل اس قدر پسند ہے پتا نہیں کیوں تمہیں.....“

مولیٰ ربیعہ کی باتیں سن کر یک دم غصے میں آ گئی۔

”بس کرو ربیعہ! بس کرو۔ وعظ اور نصیحت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ تمہارے لیے یہ سب کچھ کہنا اس لیے آسان ہے کیونکہ یہ سب تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔ لیکن میں اس شخص کو معاف نہیں کر سکتی۔ میں اسے دینا سمجھ کر عبادت کروں۔ اس کی عظمت کے گن گاؤں صرف اسے لیے کیونکہ اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ میری بچی کو اپنا نام دے دیا۔ لیکن میں یہ سب کیوں کروں اگر اس نے مجھ سے شادی کی تو صرف اس لیے کیونکہ مجھے غوا اس نے کروا دیا تھا اگر اس نے میری بچی کو اپنا نام دیا تو صرف اس لیے کیونکہ یہ اسی کی بچی تھی۔ کسی دوسرے کی نہیں۔ اگر میرے ساتھ یہ سب کسی اور نے کیا ہوتا اور پھر اسنند مجھ سے شادی کرتا تو میں بھی اسے عظیم سمجھتی لیکن اب نہیں۔ تم چاہتی ہو۔ میں روپیہ اور آسائشیں دیکھ کر سب کچھ بھول جاتی۔ کیا یہ چیزیں کسی عورت کی عزت کا متبادل ہو سکتی ہیں کیا ان چیزوں کے بدلے ایسے جرم معاف کر دینے چاہیں۔ نہیں کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ زندگی ان چیزوں کے بغیر بھی گزارا جاسکتی ہے۔“ ربیعہ یک دم اس کی بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

”ان چیزوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ یہ تم مجھ سے پوچھو۔ فاطمہ سے پوچھو۔ ان سے پوچھو جن کے پاس یہ نہیں ہیں۔ میں تمہیں اپنے اور فاطمہ کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔ چاہتی ہوں پاکستان کس لیے آئی ہوں اس لیے نہیں کہ میری بچیاں آرام سے یہاں ایڈ جسٹ ہو جائیں بلکہ اپنے شوہر سے بھاگ کر آئی ہوں۔“

مولیٰ کو ربیعہ کی بات پر جیسے شاک لگا تھا۔

”شادی سے پہلے ہی کسی انڈین عورت سے اس کے تعلقات تھے اور یہ تعلقات شادی کے بعد بھی جاری رہے۔ مجھے جب اس عورت کا پتا چلا تب میری جڑواں بیٹیاں دو ماہ کی تھیں۔ میرے پاس اسے چھوڑنے کا کوئی راستہ نہیں تھا نہ ہی میں اسے چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس شخص نے کبھی مجھے گھر کے اخراجات کے لیے ایک روپیہ نہیں دیا بلکہ مجھے جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی لے جاتا تھا کیونکہ اپنی تنخواہ سے اس کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے اور میں مجبور تھی اگر

اسے روپے ندوبتی تو وہ ہنگامہ برپا کر دیتا۔ مجھ پر تشدد کرتا پھر کئی کئی دن گھر نہ آتا۔ اور میں اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ تم روپے کو اس لیے اہمیت نہیں دیتیں کیونکہ تمہاری ہر ضرورت بنا مانگے پوری ہو جاتی ہے۔ مجھ سے روپے کی قدر پوچھو میں انگلینڈ میں جا ب کرتی تھی لیکن میرے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے پورے روپے نہیں ہوتے تھے۔ مجھے اپنے والدین سے روپے لینے پڑتے اور جو لائونس میری بیٹیوں کو گورنمنٹ کی طرف سے ملتا تھا۔ اس سے میں گھر چلاتی تھی۔ ساتھ اور نام کرتی تھی۔ وہاں سے اس لیے بھاگ آئی ہوں کہ اب بیٹیاں بڑی ہو رہی تھیں۔ ان کی ضرورتیں بڑھ رہی تھیں اور وہ شخص میری جان کو عذاب کی طرح چماتا ہوا تھا۔ یہاں کم از کم میں اتنا تو کمالاتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں کی ضرورتیں پوری کر سکوں۔ ان کے سامنے وہ تماشے تو نہیں ہوتے جو انگلینڈ میں وہ شخص کرتا تھا لیکن جا ب کرنے کی وجہ سے میں سارا دن اپنی بیٹیوں کی شکل دیکھنے کو ترستی رہتی ہوں حالانکہ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ تین اور چار سال لیکن میں کیا کروں اگر کام نہ کروں تو ان کے سکول کی فیس کہاں سے دوں گی؟ گھر کا خرچ کہاں سے چلاؤں گی؟ کل کو ان کی شادیاں کہاں سے کروں گی؟ اپنی ہزار ضروریات اور خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے کیونکہ روپے نہیں ہے۔ ذرا خود کو میرے ساتھ کھینچ کر اور دیکھو کون سی چیز ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ جس سکول میں زاشی پڑھتی ہے۔ میں وہاں اپنی بیٹیوں کو بھیجنے کا صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہوں۔ تم نے کبھی سوچا گھر کے خرچ کے لیے روپے کہاں سے آئیں گے؟ من کون دے گا؟ زاشی کے سکول کی فیس کے لیے کہاں سے روپے لوں گی۔ ملازموں کو تنخواہ کون دے گا۔ تمہارا خرچ کہاں سے پورا ہو گا۔ نہیں تمہیں کبھی یہ سب سوچنا نہیں پڑا۔ اس لیے کہ یہ سب ذمہ داریاں اسفند نے اپنے کندھوں پر اٹھائی ہوئی ہیں۔

ٹھیک ہے اب وہ جا ب کرتا ہے یہ سب افورڈ کر سکتا ہے لیکن مول! اس نے تب بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی جب وہ ادھر ادھر چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے گھر کا خرچ چلاتا تھا حالانکہ اس نے زندگی میں کبھی اس طرح تھوڑے بہت روپے کمانے کے لیے دھکے نہیں کھائے تھے پھر بھی وہ صرف اس لیے کام کرتا رہا کیونکہ اس نے تمہیں اور زاشی کو سپورٹ کرنا تھا۔ جس طرح وہ زاشی کے ما زخزے اٹھاتا ہے۔ اس طرح میرے شوہر نے کبھی نہیں کیا۔ اس شخص نے تو کبھی انہیں گود میں اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ پھر بھی میں اس آدمی سے طلاق لینا نہیں چاہتی کچھ نہ ملے کم از کم نام تو رہے کل کو بیٹیاں بیاہنے ہوئے یہ کہنا نہ پڑے کہ وہ کسی مطلقہ کی بیٹیاں ہیں۔

جانتی ہو فاطمہ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے شوہر نے یہاں پاکستان میں بھی کسی کے ساتھ شادی کی ہوئی تھی اور اسے اس بات کا تب پتا چلا جب اپنے سر کی وفات کی وجہ سے انہیں پاکستان شفٹ ہونا پڑا۔ وہ شخص اسے کس طرح ٹھک کرتا ہے۔ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ اس نے شوہر سے خلع کے لیے درخواست دائر کی تو وہ اس کے پچے چھین کر لندن اپنی بہن کے پاس چھوڑ آیا۔ چھ ماہ وہ بچوں کے لیے روٹی چینی رہی پھر مجبوراً اس نے خلع کا مقدمہ

واپس لے لیا اور اب وہ شوہر کے ساتھ ہی ہے۔ وہ شخص نذو اس پہلی بیوی کو طلاق دینے پر تیار ہے اور نہ ہی فاطمہ کو چھوڑ رہا ہے اور فاطمہ اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور ہے۔ وہ شخص اسے چاہ کرنے بھی نہیں دیتا۔ لیکن مول! تم دیکھو پھر بھی وہ صرف بچوں کی وجہ سے اپنی خوشی کی قربانی دے رہی ہے جیسے میں دے رہی ہوں۔ تمہیں ہم نے اسی لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہوگی۔ اسی لیے ہم نے تم سے ملنے کی کوشش نہیں کی مول! یہ زندگی اسی طرح ہے یہاں رہنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی رہنا پڑتا ہے قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں اور فاطمہ اپنی زندگی نہیں سنوار سکتے کیونکہ یہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن تم تو خوش رہ سکتی ہو۔ تمہارے گھر کی خوشی تو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے پھر تم اسے کیوں برباد کرنے پر تکی ہو۔ تمہارے بھائیوں اور رشتہ داروں نے تمہیں اس لیے قبول کر لیا کہ تم ایک ایس بی بی ہو اگر ایک معمولی مزدور کی بیوی ہوتیں تو وہ کبھی تمہاری سنائی ہوئی کہانی پر یقین کرتے نہ تمہارے ساتھ میل بول رکھتے۔ جس شخص کے ساتھ تم دس سال سے رہ رہی ہو اسے معاف کر دو وہ اپنے اس گناہ کی سزا کاٹ چکا ہے۔ پچھلے دس سالوں نے اسے کیا دیا ہے۔ تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی۔ تمہیں کھونے کی اذیت اٹھانا نہیں پڑی۔ اس نے محبت بھی کی تھی اور اسے کھویا بھی۔ کیا اس سے زیادہ تکلیف دہ بات کوئی ہو سکتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا جائے لیکن اس شخص نے ایسا کیا۔ مول! دس سال تم نے چلتے ہوئے گزارے ہیں۔ اب اس آگ کو بجھ جانے دو یہ دوسروں کو جتنا جلانے گی جلانے گی لیکن تمہارے وجود کو تو یہ راکھ کر دے گی۔ اب کوئی غلطی مت کرنا اب شاید پہلے کی طرح تمہیں کوئی موقع نہ ملے۔“

مول نے پہلی بار ربیعہ کو روٹے ہوئے دیکھا تھا اور وہ ساکت تھی کسی جسے کی طرح۔ وہ سوچتی تھی فاطمہ اور ربیعہ بہت خوش ہیں بہت اچھی زندگی گزار رہی ہیں مگر وہ تو.....

ربیعہ کے گالوں پر سینے والے آنسو مول کے وجود کو متحمل کر رہے تھے۔ اس کے اعصاب جیسے شل سے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک عجیب سی محکم تھی جو اس کے وجود کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ وہ ربیعہ کے گھر سے اسی عالم میں کچھ کہے بغیر آئی تھی۔ ربیعہ نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے بھابھی سے کہہ دیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ سونا چاہتی ہے اس لیے اسے کھانے کے لیے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ کمرے لاک کر کے وہ جا کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

ربیعہ نے ٹھیک کہا تھا۔ اسفند نے اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ اس نے اسے اور زاشی کو ہمیشہ سب سے اچھی چیز ہی دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پچھلے دس سال میں ہمیشہ وہ کام کیا تھا جو اسفند کو ناپسند تھا۔ جس سے وہ روکتا تھا۔ بہت دفعہ اس نے اپنی زبان کے نشتر چلائے تھے ہر بار اسفند نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہر بار وہی خاموش رہتا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس نے اسفند سے لڑتے ہوئے زاشی کے سامنے اسے ناجائز

بس اک داغِ ندامت

اولا دکھا تھا اور بعد میں اس نے کس طرح موئل کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے اپنے کیے کی معافی مانگی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ زاشی کے سامنے دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کہے۔ کوئی چیز اس کے گالوں کو بھگونے لگی تھی۔

وہ جانتی تھی۔ اسفند نے اچھی تعلیم کے لیے نہیں اس کے طعنوں اس کی باتوں سے بچانے کے لیے زاشی کو بورڈنگ داخل کروا دیا تھا اور پھر کئی دنوں تک وہ گم صم رہا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اسفند زاشی کے بغیر نہیں رہ سکتا نہ وہ باپ کے بغیر رہ سکتی تھی پھر بھی اس نے اسفند کو زاشی کو بورڈنگ میں داخل کروانے سے منع نہیں کیا تھا۔ اسے جب فصد آتا تھا وہ جودل میں آتا اسفند اور زاشی کو کہہ دیتی اس نے کبھی پروا نہیں کی کہ زاشی اس کی باتوں سے کیا سمجھ رہی ہوگی۔ اس کے سامنے زاشی کا چہرہ آگیا تھا۔ اسے کبھی خبر نہیں ہوتی تھی کہ زاشی کے پاس کس چیز کی کمی ہے یا اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔

یہ سب کچھ اسفند ہی دیکھتا تھا۔ وہی زاشی کے لیے شاہنگ کیا کرتا تھا۔ وہی اس کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا اور وہ..... وہ کیا کرتی تھی ہاں وہ کبھی کبھار اسے ہوم ورک کروا کر دیتی تھی لیکن صرف ہوم ورک کروا دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ کیا اولاد کو ماں سے صرف اسی ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں زاشی کا قصور نہیں تھا پھر میں نے اسے کیوں.....

آج وہ پہلی بار اپنا محاسبہ کر رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ کہی ماں تھی۔ کیسی بیوی تھی جس نے دس سال سے اپنی بیٹی اور شوہر کو سزا دے رکھی تھی۔ اسے اسفند سے نفرت تھی تو پھر اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اس کی دی ہوئی چیزوں کا فائدہ اٹھائے۔ اپنے آرام کے لیے اس کا روپیہ استعمال کرے۔ اس کے گھر میں رہے اس کا کھائے اس کا پینے اور پھر بھی نفرت کا ڈھول بجاتی رہے۔ ربیعہ نے اس سے کہا تھا۔

”تم اسفند کے گناہ کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ اللہ کو فیصلہ کرنے دو اس کی سزا کا۔ تم خود اپنی اور اس کی زندگی کو عذاب مت بناؤ۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر کھٹوں میں منہ چھپائے وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ آنسو کمال کی چیز ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں بہت شفاف نظر آتے ہیں حالانکہ پتائیں کتنا میل، کتنا کھوٹ، کتنا بچھتا وا یہ اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہے ہوتے ہیں۔

☆

”چائے لگا دو۔ میں تھوڑی دیر میں پیوں گا۔“

وہ ملازم کو ہدایات دیتے ہوئے اوپر کمرے میں آ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے لائٹ آن کی اور پھر وہ جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ صوفہ کے ایک کونے میں وہ پاؤں اوپر کیے بازو ناگوں کے گرد لیپے سر کھٹوں میں چھپائے بیٹھی

بس ایک داغِ ندامت

تھی۔ وہ چند لمحے دیکھتا رہا۔ آہٹ کی آواز پر بھی اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ بیڈ پر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اتارنے شروع کر دیئے۔ مول نے سر اٹھایا تھا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ دس سال پہلے اور آج کے اسفند میں واقعی ہی زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت سنو لائیک تھی۔ وہ مسکراہٹ جو ہر وقت اس کے لبوں پر رقصاں ریتی تھی۔ اب کہیں بھی اس کا وجود نہیں تھا۔ اس کے ماتھے پر کئی لکیروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ کینٹیوں پر جا بجا سفید بال نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ جوتے کے تھے کھول رہا تھا۔ مول اس پر نظریں جمائے رہی۔ اسفند کو شاید اچانک ہی ان نظروں کا احساس ہوا تھا۔ اس نے ایک دم سر اٹھایا۔ مول کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے اضطراب سے دیکھتا رہا پھر دوبارہ جوتے اتارنے لگا۔ وہ ایک ٹک سے دیکھتی رہی۔ وہ جوتے اتار کر کھڑا ہو گیا اور بیٹ اتارنے لگا پھر اس نے رسٹ واپس آ کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

ایک بار پھر اس نے مول کو دیکھا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ مسلسل اسے دیکھ رہی ہے اس نے ایک بار پھر مول کے چہرے سے نظر ہٹائی اس نے اسفند کے چہرے پر بے چینی کے آثار دیکھے۔ وہ کھڑا ہو کر سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ وہ پانی کا دوسرا گھونٹ پی رہا تھا جب اس نے مول کی آواز سنی۔

”اسفند حسن! میں نے تمہیں تمہارا گناہ کے لیے معاف کیا اور میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ..... وہ بھی تمہیں معاف کر دے۔“

گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ دس سال پہلے ضمیر نے جو خنجر اس کے سینے میں گاڑ دیا تھا۔ دس سال بعد دو جملوں نے اس خنجر کو نکال دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنی زندگی کے سب سے مشکل لفظ دوہرا رہی تھی۔ لیکن خنجر اس کے سینے میں بہت گہرا گھاؤ چھوڑ گیا تھا جسے مندل ہونے میں بہت وقت لگنا تھا اور جس کا نشان تو ساری عمر ہی رہنا تھا۔ وہ اب آنکھیں کھولے گالوں پر بیٹھے آنسوؤں کو پونچھ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ صوفہ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے مول کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میں تمہارا گناہ گار تھا۔ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ کوئی چیز اس بچھتاوے کو ختم نہیں کر سکتی جس کے ساتھ مجھے ہمیشہ رہنا ہے پھر بھی مول! پھر بھی دعا کرو کہ یہ سب میری بیٹی کے ساتھ کبھی نہ ہو۔ میری زاشی کو کبھی کچھ نہ ہو۔“

مول نے سترتیس سالہ اس مرد کو اپنے سامنے سر جھکائے ہاتھ جوڑے بچوں کی طرح پلکتے ہوئے دیکھا۔ اسے یاد آیا تھا۔ دس سال پہلے اس رات اس نے کہا تھا۔

”لیکن میں اپنی غلطی پر کبھی شرمندہ ہوں گا نہ تمہارا سے سامنے ہاتھ جوڑوں گا۔“

اور اب..... اب وہ گزر گیا رہا تھا۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں کو بھیسنے جتنے ہوئے بیگلی آنکھوں کے ساتھ اس

بس اک داغِ ندامت

نے اسنند کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تقام لیا تھا۔

”کوئی چیز اس اذیت کو کم نہیں کر سکتی۔ اس ذلت کو مٹا نہیں سکتی جو تم نے دس سال پہلے میرے ماتھے پر لگا دی لیکن میں..... میں سب کچھ بھول کر ایک بار پھر سے اپنی زندگی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ ایک بار پھر سے دیکھنا چاہتی ہوں کہ دنیا میں میرے لیے کیا ہے۔ ایک بار پھر سے اپنی مٹھی میں خواہشوں کی کچھ تتلیاں پکڑنا چاہتی ہوں اور پھر شاید..... شاید میں تمہارے اور زاشی کے حوالے سے کوئی خواب دیکھنے لگوں۔“

دس سال میں پہلی دفعہ اس نے جو سوچا تھا۔ وہ کہا نہیں تھا۔ وہ بس خاموش رہی تھی۔ کمرے میں پھیلی ہوئی روشنی کھڑکی سے نظر آنے والی تاریکی کو روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور تاریکی میں سے بہت کچھ نظر آنے لگا تھا۔ جو دھندلا تھا اسے تو ہمیشہ دھندلا ہی رہتا تھا۔

